نعیم طاہر

کی تاریخ کے گواہوں سے ملاقات

اِن کیمرہ

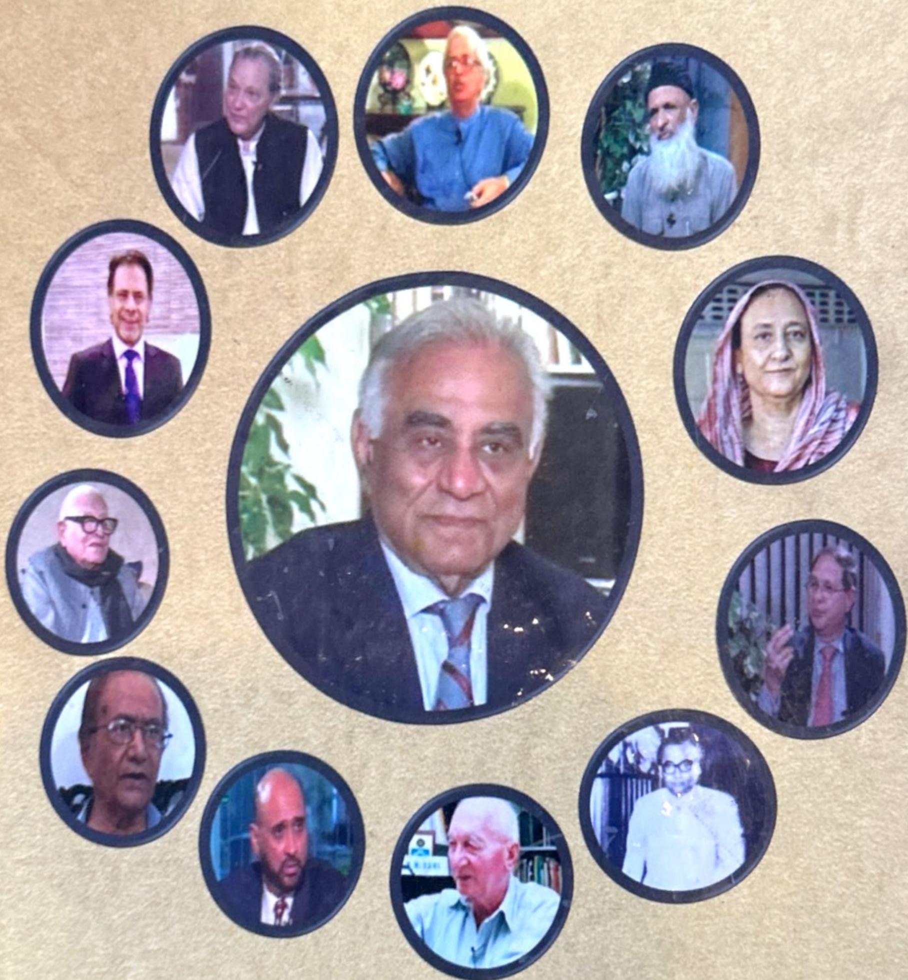

ایڈیٹر:

ڈاکٹر فرزانہ ریاض

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر

کی تاریخ کے گواہوں سے ملاقات

اِن کیمرہ

ایڈیٹر:
ڈاکٹر فرزانہ ریاض

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

801.952 Tahir, Naeem
In Camera / Naeem Tahir.-
Lahore: Sang-e-Meel Publications,
2024.
265pp.
1. Urdu Literature - Interview.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2024ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3520-0
ISBN-13: 978-969-35-3520-4

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

نمبر شمار			صفحہ نمبر
☆	تعارف:	نعیم طاہر	05
☆	ایڈیٹر نوٹ:	ڈاکٹر فرزانہ ریاض	08
	شخصیات		
۱۔	حنیف رامے		12
۲۔	عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی		61
۳۔	ڈاکٹر جاوید اقبال		86
۴۔	جہانگیر خان		108
۵۔	بہرام ڈی اواری		132
۶۔	ایف ای چوہدری		154
۷۔	حنیف محمد		180
۸۔	ڈاکٹر احمد حسن دانی		208
۹۔	ناصر علی شاہ		234
۱۰۔	محمود علی*		256

نوٹ:

☆ محمد حنیف رامے صاحب کا انٹرویو، جس کو ٹیلی کاسٹ کرنے سے معذرت کر لی گئی تھی۔ بیشتر انٹرویو پاکستان ٹیلی ویژن سے 2002ء میں سلسلہ وار ٹیلی کاسٹ ہوئے۔

* محمود علی صاحب کا انٹرویو نشر ہوا لیکن باوجود کوشش کے پی۔ ٹی۔ وی سے حاصل نہیں ہو سکا۔

تعارف

مجھے تاریخ میں دلچسپی رہی ہے اور مجھے سن 2000ء میں خیال آیا کہ پاکستان میں ایسی شخصیات ہیں جو تاریخ کو بنتے بگڑتے دیکھتی رہی ہیں یا کسی تاریخ ساز لمحے کی حصے دار رہی ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ ایسے لوگوں سے اگر گفتگو کر کے ریکارڈ کیا جائے اور اُن سے معلومات حاصل کی جائیں تو یہ دیکھنے والوں کے لیے بہت اہم آگہی ہوگی۔ چنانچہ میں نے پی۔ ٹی۔ وی کو پروگرام تجویز کر دیا کہ میں اس نوعیت کا ایک پروگرام کرنا چاہتا ہوں جس سے اُنہوں نے بھی اتفاق کیا۔ اُس وقت جو بڑی شخصیات سامنے تھی اُن میں عبدالستار ایدھی صاحب، جہانگیر خان صاحب، حنیف رامے، کرکٹر حنیف محمد، ڈاکٹر جاوید اقبال اور اس طرح کے اہم لوگ شامل تھے۔

حال ہی میں مجھے خیال ہوا کہ یہ ریکارڈنگز بہت قیمتی ہیں کیونکہ ان میں لوگوں کے تاریخ ساز لمحات کے تجربے شامل ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ ان کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ چنانچہ میں نے کوشش کی کہ انٹرویوز کے سکرپٹ بنائے جائیں۔ جب سکرپٹ بنائے تو احساس ہوا گفتگو میں دیکھنے والا وہ باتیں آسانی سے سمجھ جاتا ہے جو گفتگو کا حصہ ہوں، کبھی اس میں واقعات آگے، کبھی پیچھے اور تھوڑا بہت ہنسی مذاق بھی چل پڑتا ہے۔ لیکن جب اسکو ضبطِ تحریر میں لایا جائے تو وہ اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ضروری محسوس ہوا کہ تحریر میں جو چیز لائی جائے اس کو تحریر کے ذریعہ اظہار میں ڈھالنا چاہیے تاکہ ''پڑھنے والے'' آسانی سے سمجھ سکیں اور اس سے لطف اُٹھا سکیں۔

یہ بہت اہم کام تھا۔

خوش قسمتی سے اس موقع پر میرا تعارف گورنمنٹ کالج کے وائس چانسلر ڈاکٹر حسن امیر شاہ نے پروفیسر ڈاکٹر فرزانہ ریاض سے کروایا۔ وہ مجھ سے ایک ریسرچ سکالر کی مدد حاصل کرنے کے لیے آئی تھیں۔ باتوں باتوں میں اُنہیں میرے کام اور تحریروں میں دلچسپی پیدا ہوئی، میرا بہت سا کام نامکمل ہے۔ پروفیسر فرزانہ ریاض نے کہا میں آپ کی مدد کر کے مکمل کرواؤں گی۔ مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے اُن سے کہا ''آپ بھاگ جائیں گی''۔

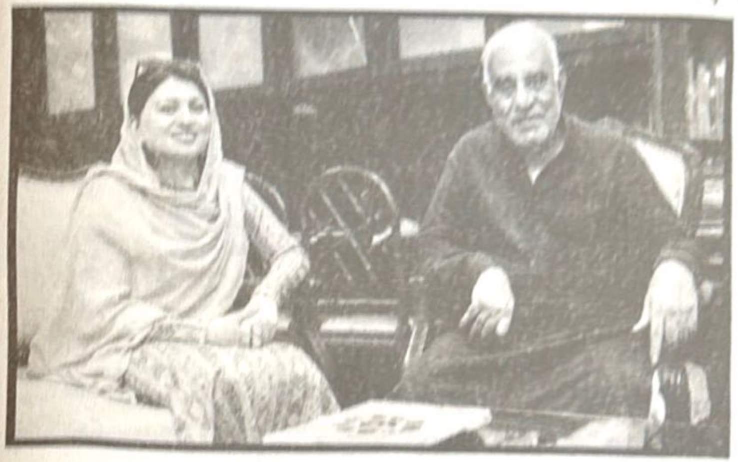

پروفیسر فرزانہ ریاض نے اعتماد سے کہا: ''نہیں، میں نہیں بھاگوں گی، مکمل کروا کر رہوں گی۔''

میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ اُنہوں نے حامی بھر دی کہ میری نامکمل تحریروں کو بھی مکمل کرنے میں تعاون کریں گی۔ وہ ثابت قدم رہیں۔ چنانچہ میں نے اُن کو یہ کام سونپ دیا اور وہ اس کو بخوبی ادا کر رہی ہیں۔

یہ واضح ہوا کہ گفتگو ایک اور طرزِ بیاں ہے اور تحریر ایک دوسرا طرزِ بیان ہے۔ میں ڈاکٹر فرزانہ کا بہت ممنون ہوں کہ اُنہوں نے اس کام میں مدد کی۔ جو اب میرے اور آپ سب کے لیے فائدہ مند ہے۔ اب یہ ایک تحریر کی صورت میں آپ کے پیشِ نظر ہے۔ امید ہے آپ اس سے لطف اندوز بھی ہوں گے اور آپ میں علمی اور تاریخی آگہی پیدا ہوگی۔

یہ سلسلہ ''ان کیمرہ'' کے نام سے پی۔ٹی۔وی سے نشر ہوا۔ اس میں حنیف رامے صاحب کا انٹرویو TV نے پالیسی میں اختلاف کی وجہ سے نشر نہ کیا۔

اس کے علاوہ جناب محمود علی صاحب کا انٹرویو بھی شامل نہیں جو بہت اہم ہے لیکن باوجود کوشش کے پی۔ٹی۔وی سے مہیا نہ ہوا۔

نعیم طاہر

26 فروری، 2022ء

ایڈیٹر نوٹ

بہت دِنوں کی بات نہیں ہے جب میں اپنے محترم اُستاد پروفیسر ڈاکٹر حسن امیر شاہ کے توسط سے معروف فلم، تھیٹر، ٹیلی ویژن کے لکھاری، اداکار، مفکر، کالم نگار، محقق، الحمرا کے منتظم، دانشور نعیم طاہر صاحب کے گھر مصاحبے کی غرض سے گئی۔ ایک جہاں دیدہ شخص سے سوال وجواب کا سلسلہ نسبتاً آسان نہیں ہوتا۔ لہٰذا دل میں کُچھ خوف تھا، تھوڑی سی سراسیمگی اور کافی کُچھ جاننے کا ولولہ بھی۔

ملاقات حسبِ توقع بہت ثمر آور رہی، ماضی کی یادیں، حال کی بے حالیاں اور ممکنہ مستقبل کی عبرتیں، یہ سب کُچھ ملاقات کا قصہ رنگین تھا۔

اسی نشست میں یاسمین طاہر صاحبہ سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یاسمین طاہر مشہور مصنف سیّد امتیاز علی تاج اور مصنفہ حجاب امتیاز علی کی صاحبزادی ہیں۔ اُن کے والدین ادبی دُنیا کی عظیم شخصیات ہیں۔ یاسمین طاہر نے اپنا مقام بطور ایک براڈ کاسٹر بنایا۔ اُنہوں نے 30 سال تک ریڈیو پاکستان سے مقبول ترین پروگرام کیے جن میں ''سات رنگ''، "42292" فون کے جوابات پر مشتمل پروگرام اور ''فوجی بھائیوں'' کے پروگرام کے علاوہ ''مغربی موسیقی'' کے پروگرام شامل ہیں۔ یاسمین طاہر وہ واحد شخصیت ہیں جن کو بطور براڈ کاسٹر پاکستان کی طرف سے ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا گیا۔ یاسمین طاہر کی شادی نعیم طاہر سے 1962ء میں ہوئی۔ اس شادی میں

اُن کی اپنی اور والدین کی پسند شامل تھی۔

باتوں کے سلسلے میں ڈرامہ، اردو ادب، تھیٹر، الحمرا، تاریخ ساز شخصیتوں، غرض ایک پورے دور پر ایک عہد ساز شخصیت کی گفتگو نے دل وجگر کو نئی اور پرانی روشنیوں سے منور کر دیا۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے اُن کی وابستگی نے انہیں مزید مہمیز کیا۔ باتوں باتوں میں نوے کی آخری دہائی کے مشہور پروگرام ''اِن کیمرہ'' کا ذکر ہوا۔

یہی مقام اس کتاب کے منصۂ شہود پر آنے کا ہے۔ محترم نعیم طاہر صاحب نے ''اِن کیمرہ'' کے معروف مصاحبوں کا ذِکر کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان انٹرویوز کو نہ صرف ترجمہ کروں بلکہ ترجمے سے کئی آگے ان شخصیتوں کے باطن میں اُتر کر ان کے تجربوں کے ساتھ سفر کروں۔ افکار کی پیچیدگیوں کو سلجھاؤں، خیال کو روانی میں لاؤں اور لفظ کا رشتہ سماعتوں سے جوڑ دوں۔ یہ کام یقیناً ایک مترجم، مدون، مرتب اور اس طرح کی دوسری بھاری بھر کم اصطلاحوں سے آگے کا ہے، اب خوش ذوق قارئین اس کو جو نام دیں، میں معاملہ اُن کی صوابدید پر چھوڑتی ہوں۔ لیکن یہ رام لیلیٰ جتنی سیدھی نظر آتی ہے اتنی ہے نہیں۔ کُچھ مراحل سے ہوتے ہوئے جب یہ انٹرویوز میرے ہاتھ تک پہنچے تو دیکھا کہ تنوع کا ایک جہاں آباد ہے۔ طرح طرح کے لوگ، گھاٹ گھاٹ کے پانی، بھانت بھانت کی بولیاں، غرض کیا دکھایا جائے اور کیا نہیں۔ آنکھ کو نظارگی سے فرصت نہ رہی، سمندر کی گہرائیوں سے لے کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے والی بہرام ڈی اواری کی اَن دیکھی کہانیاں، سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں محفوظ کر لینے والے محترم عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی صاحبہ کی دل سوز حکایتیں۔

حسن ظاہر اور لطافت معنیٰ کو اپنے کیمرے کی آنکھ سے امر کر دینے والے پاکستان کے پہلے بین الاقوامی شہرت یافتہ فوٹوگرافر ایف ای چوہدری کی گلابی اور زندہ داستان، سیاسی خرخشوں، عروج وزوال کی عبرت انگیز روائیتوں والے حنیف رامے کی بصیرت۔ انہی کے ہم نام معروف گجراتی کرکٹر حنیف محمد کی تیز رفتار اور انقلابات سے بھرپور زندگی جوان کی بلّے بازی سے کم دلچسپ نہیں۔ یہاں پر یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حنیف محمد مرحوم کی زبان اور بیان نہ قابلِ فہم حد تک مشکل بلکہ اہمال آمیز جملوں پر مبنی تھا۔ میں نے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑا نہیں بلکہ گلے سے لگایا۔

میں جانتی ہوں کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بارے میں کوئی بھی جُملہ اور لفظ کفایت نہیں کرے گا۔ لہٰذا سورج کو چراغ کیوں دکھایا جائے۔ جہانگیر خان اسکواش کی عالمی دُنیا کا وہ نام ہے کہ یا اسکواش نہیں یا اُن کا نام نہیں۔ اس بے مثال، تیز رو شخصیت کی عملی اور دقت آمیز کہانی بہت سے جگر دار لوگوں کو حیرت میں مُبتلا کر دے

گی۔

قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی سرمایے اور دیانتدارانہ کاروبار کے جہانِ پیچیدہ کا ایسا نام جن کا ثانی اور سایہ ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گا۔ محترم خادم علی شاہ بخاری صاحب کے صاحبزادے ناصر علی شاہ بخاری ہے۔ ان کا انٹرویو آج کل کی چکا چوند زندگی میں کئی لوگوں کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر احمد حسن دانی جن کے نام سے بے دماغ واقف ہوں تو نہ ہوں باقی تو کل جہاں معرفت رکھتا ہے۔ ان کا انٹرویو کھنڈر ہوتی دنیاؤں کے نقشے مرتب کرنے کی نا مختتم جدوجہد سے عبارت ہے۔ بقول ارسلان راٹھور:

سر بہ زانوں جو میں بیٹھا ہوں تجھے کیا معلوم
کتنی دنیاؤں کا موجود ہے نقشہ مجھ میں

یہ سبھی نام سچ پوچھیے تو اپنے اپنے دائرے میں تاریخ سے بڑے ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے لوگوں کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ تفصیل میں جانے کی بجائے اجمال سے کام لیتے ہیں۔ تصویر بنانے کی بجائے اشارے کرتے ہیں، وضاحتیں دینے کی بجائے استعارہ سازی کرتے ہیں۔ میں نے ان تمام انٹرویوز کی تخریج، تکمیل اور تسہیل بڑی دماغ سوزی سے کی ہے۔ ترجمے کی دُنیا میں یہ میرا پہلا قدم ہے۔ میرا اعتماد بلند ہے لیکن انسان خطا سے خالی تو نہیں میں اپنی اس محنت میں کتنا کامیاب ہوئی ہوں اور رنگ کتنا چوکھا آیا ہے اس کا فیصلہ تو اربابِ نظر اور وقت کرے گا، البتہ اگر قاری کو پڑھتے ہوئے کسی نادانستہ غلطی کا احساس ہو اور وہ مجھے اس سے آشنا کروائے تو میں ممنونیت سے لبریز ہوں گی۔

شکریہ کی فہرست زیادہ طویل نہیں ہے اس سے دوستوں میں میری انتخابی نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ یقیناً اگر نعیم صاحب نہ ہوتے تو اس کام کی داغ بیل ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ نعیم طاہر ایک ایسی شخصیت کا نام ہے، جس کے گرد رومانوی ہالے میں امیدوں، امنگوں اور عزم و حوصلہ کی وہ داستانیں ملتی ہیں جن سے ہمارے دل میں کچھ کام کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اللہ پاک اُن کو عافیت سے سلامت رکھے۔

پاکستان کے معروف سائنس دان، ماہر تعلیم، طبعیات دان سابقہ وائس چانسلر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور پروفیسر ڈاکٹر حسن امیر شاہ (تمغۂ امتیاز) میری اس ملاقات کا وسیلہ ہیں۔ ڈاکٹر حسن امیر شاہ صاحب علمی و ادبی حوالوں سے مجھ بے دست و پا کے لیے ہمیشہ خضرِ راہ ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے لیے دُعا اور شکریے کے لفظ چھوٹے ہیں۔

میں اپنے برادرانِ عزیز فرخ احمد اور علی عظمت اور ان کی مخلص ہم سفروں اور اپنی دلی دوستوں امل فرخ

اور ناجیہ عظمت کی ممنون ہوں کہ میری زندگی کی لطیف اور پاکیزہ خوب صورتیوں سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

میرے بچے میری دُنیا ریئسہ، بختاور، محمد یوسف اور محمد عبدالرحمن ہمیشہ میرے لیے جس ذہنی و جسمانی تقویت کا باعث بنتے ہیں ان کے بغیر کامیابی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

میری اس پہلی کتابی کاوش میں وہ دونوں مقدس ہستیاں میرے سامنے کھڑی ہیں جن کے بغیر میں نہ کچھ تھی اور نہ ہی آئندہ ہوں گی۔ اللہ پاک ان دونوں کو فردوس مکین اور پروین نصب کرے۔ (آمین)

اور اِن تمام ہستیوں سے بڑھ کر وہ اعلیٰ وارفع ذات جس نے مجھے عافیت، صحت اور آبرو سے زندہ رکھا ہوا ہے۔ اللہ پاک مجھے اپنے فضل سے شکر کی توفیق عطا فرمائے۔

ڈاکٹر فرزانہ ریاض

(Ph.D)

حنیف رامے

ابتدائیہ:

قوموں کی زندگی میں بعض لمحات اتنے منفرد اہم اور تاریخی ہوتے ہیں کہ ان لمحوں کی اہمیت اور حیثیت کا مقابلہ کئی صدیاں بھی مل کر نہیں کر سکتیں۔ یہ منفرد و قیمتی لمحات دراصل تاریخ کا وہ حساس موڑ ہوتے ہیں جہاں کوئی قوم اپنے لیے عزت و وقار اور غرور و تمکنت یا ذلت و رسوائی اور غُلامی و محکومی میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرتی ہے۔ بُزدل، ڈرپوک، ابن الوقت اور غُلام ذہنیت کے لوگ ان تاریخ ساز لمحوں کی قدر و قیمت نہیں جانتے اور نہ ہی اُن کے دِل و دماغ کسی چیلنج کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، نتیجتاً ایسی اقوام شاہراہ حیات پر دوسری اقوام سے پیچھے رہ جاتی ہیں اور پھر ان اقوام کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ قومیں ماضی کی گرد میں کھو کر قصہ پارینہ بن کر تاریخ کی بوسیدہ کتابوں کا حصّہ بن جاتی ہیں، لیکن اس کے برعکس جرات منداور بہادر لوگ تاریخ کے ان نازُک لمحات میں ہوش مندی اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے نہ صرف ایسے تاریخی فیصلے کرتے ہیں جو قومی زندگی کی بقاء استحکام اور تحفظ کے لیے لازم و ملزوم ہوں، بلکہ تاریخ کو سامنے لانے میں ایک چشم دید گواہ کی صورت میں مُشکل ہوتے ہیں۔ یہی ہماری جُستجو ہے۔ آیئے اس جستجو کے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیں کہیں نہ کہیں چند دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کے نام بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جنھوں نے قیام پاکستان کے دنوں سے لے کر استحکام پاکستان کی تحریکوں میں لازوال کردار ادا کیا۔

اس دانشور طبقے نے ادبی میدان سے باہر نکل کر سیاسی میدان میں بھی قسمت آزمائی کرنے کو فوقیت دی۔

ان میں سے ایک معتبر حوالہ محترم جناب محمد حنیف رامے کا ہے جو آج ہماری اس گفتگو کے شریک سفر بھی ہیں۔ حنیف رامے صاحب پاکستان کے نامور ادیب، شاعر، مصور، خطاط، دانشور اور تاریخ ساز سیاستدان ہیں۔ سیاست، انسانیت سے ان کی دلچسپی کا ایک حوالہ ہے۔

وہ کچھ عرصہ صدر فیلڈ مارشل ایوب خان کی کنونشن لیگ سے وابستہ رہنے کے بعد دسمبر 1967ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی اصولی کمیٹی کے رکن بنے۔ 1972ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے عہد میں وہ پہلے پنجاب حکومت میں مشیر خزانہ بنے۔ فروری 1973ء میں گورنر پنجاب منتخب ہوئے اور وزیرِ اعلیٰ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ پیپلز پارٹی کے دوسرے دورِ حکومت 1993ء میں پنجاب اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوگئے۔

میں حنیف رامے صاحب کو اپنی اور ناظرین کی جانب سے دِلی طور پر خوش آمدید کہتا ہوں۔

گفتگو:

حنیف رامے: مہربانی۔

نعیم طاہر: مسرت والم، اُمید و بیم اور بے اماں روز و شب کی یہ کہانیاں ایسا زندگی نامہ ہے جسے فنی سطح پر بیان کرنا اُسی صورت ممکن ہوتا ہے جب انسان تخلیقی دائرے کے اندر رہ کر زندگی گزارتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اپنے بچپن کی قدیم ترین یادوں سے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کریں؟

حنیف رامے: میں یکم مارچ، 1933ء کو ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں جو ''بڑا گھر'' کے نام سے موسوم ہے، پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام چودھری غلام حسین تھا۔ میں نے اپنے بچپن کی ابتدائی تین یا چار برس یہیں گزارے لیکن اس کے بعد ہم لاہور جا بسے۔ میرے آباؤاجداد کا تعلق لاہور سے ہی ہے۔ میرے دادا نے ضلع شیخوپورہ میں کچھ زمین خریدی اور اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کا قُرعہ میرے والدِ محترم چودھری غُلام حسین کے نام نِکلا۔ اپنے والدِ محترم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہ اپنے چھوٹے سے کنبے کے ہمراہ شیخوپورہ نقل مکانی کر گئے۔ ایک روز انتہائی دردانگیز ماجرا پیش آیا، میرے دادا بہت علیل ہوگئے۔ میرے والد کے بھائیوں نے شیخوپرہ والی زمین کی وراثتی تقسیم کا تقاضا کر دیا اور کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے انتقال کے بعد چودھری غلام حسین زمیں کی ملکیت کا دعوے دار نہ ہو جائے۔ میرے والد کو اپنے بھائیوں کی یہ بات سخت ناگوار گزری، کیونکہ انہوں نے اپنے والد کے حکم پر ہی اپنا رُخِ حیات بدلا۔ اپنے بچوں کو شہر سے دیہات منتقل کیا، ایک بے آباد بنجر زمین کو آباد کر کے اُسے زرخیز بنایا، اُس کی آمدنی سے اپنی بہنوں کی شادیاں کی، اپنے ایک بھائی کو گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم دِلوائی۔ میرے والد صاحب کو اس بات کا اتنا دلی صدمہ ہوا کہ حکم دیا کہ ہم اس گھر سے ایک تنکا بھی اُٹھا کر اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ ہم اسی

بے سروسامانی کی حالت میں بیل گاڑی میں بیٹھے اور لاہور پہنچ گئے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ آج بھی ہمارا معاشرہ کسی اصول پر چل رہا ہے تو وہ عدم اعتماد یا بے اعتمادی ہے۔

نعیم طاہر: آپ بہت کم عُمری میں ہجرت کے تجربے سے گزرے۔

حنیف رامے: جی۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ بلاشبہ اس ایک واقعہ نے میری اور میری بہن بھائیوں کی پوری زندگی کا رُخ موڑ دیا۔ جب اس چھوٹے سے خاندان نے لاہور جیسے بڑے شہر میں اپنا پڑاؤ ڈالا تو غمِ روزگار نے آگھیرا، لیکن ہم شب وروز کی سخت محنت اور جاں فشانی سے خُود کو منوانے میں کامیاب رہے۔ یہ ذہنی دباؤ کا زمانہ تھا۔ ساری دُنیا مہنگائی اور روزگار جیسے مسائل سے دوچار تھی، اور یہی وہ زمانہ ہے جب 1939ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ ہندوستان کا ابھی بٹوارہ نہیں ہوا تھا۔ ہندوستان کے لوگ جنگ کے عالمی منظر نامے پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ ایک عجیب بات آپ کو بتاؤں کہ برِصغیر کے لوگ اس جنگ کے دور اور اس کے اثرات کا شعور آگہی ہونے کے باوجود، جب ہٹلر جیتتا تھا اور انگریز کو کہیں شکست ہوتی تھی تو سارے ہندوستان میں جشن منایا جاتا تھا۔

نعیم طاہر: خوشی منائی جاتی تھی؟

حنیف رامے: کیونکہ جو دُشمن ہوتا ہے وہ دوست بن جاتا ہے۔ ایک تو دنیا میں رُونما ہونے والے حالات وواقعات سے آگاہی کا سلسلہ شروع ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ، یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں موجود سب سے بڑی اور بااثر دو سیاسی جماعتیں آمنے سامنے تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور راج گوپال اچاریہ کی سربراہی میں اور آل انڈیا مسلم لیگ قائدِاعظم محمد علی جناح کی قیادت میں الگ مملکت کے قیام کے مصروفِ عمل تھیں تو دوسری جنگِ عظیم، آزادی کی تحریک اور ذہنی دباؤ، ان سب نے سہ آتشہ بن کر میرے چھوٹے سے وجود پر گہرا اثر ڈالنا شروع کیا۔

نعیم طاہر: یقیناً، یقیناً۔

حنیف رامے: سونے پر سُہاگہ کہ میرے بھائی نے لاہور آکر کتابوں کی فروخت اور اشاعت کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس زمانے میں تمام اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز لاہور تھا۔ مکتبہ اردو ادب لاہور، مکتبہ جدید لاہور اور پنجاب بک ڈپو جیسے اشاعتی اداروں اور یہاں سے چھپنے والے جریدے ادب لطیف،

سویرا اور نصرت نے لاہور میں ایک خُوشگوار ادبی فضا بنا رکھی تھی۔ ہندوستان کے تمام بڑے دانشور ان اشاعتی اداروں سے منسلک تھے۔ ان ادباء وشعراء سے نہ صرف گفت وشنید اور ملاقات کا شرف حاصل رہا بلکہ میرے تخلیقی مزاج کی آبیاری بھی کی۔

نعیم طاہر: اب ہم 1944ء یا 1945ء کے زمانے کی بات کر رہے ہیں نا؟

حنیف رامے: 1946ء میں، میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور 1947ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

نعیم طاہر: آپ نے کس سکول سے میٹرک کیا؟

حنیف رامے: میرے سکول کا نام ''گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول'' بھاٹی گیٹ لاہور تھا۔

نعیم طاہر: کیا شہر لاہور کی کوکھ سے بہت ساری دوستیوں اور محبت کی انوکھی جہتوں نے بھی جنم لیا؟

حنیف رامے: 1945ء یا 1946ء میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب لاہور میں بستے تھے۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: تقسیم کے وقت بہت خوفناک قسم کے فسادات کی مد میں لاہور شہر تقریباً سارا جل کر راکھ ہوگیا۔

نعیم طاہر: اور شاہ عالم دروازے۔۔۔۔

حنیف رامے: جی شاہ عالم اور اُس کے آس پاس کے سب علاقے جل گئے تھے۔ لیکن ہمارے ادارے میں سب دانشور تشریف لاتے تھے۔ مثلاً اگر وہاں باری علیگ بیٹھے ہوتے تھے تو راجندر سنگھ بیدی بھی آتے تھے بلکہ مجھے تو اُن سے انگریزی پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

نعیم طاہر: بہت خوب۔

حنیف رامے: کرشن چندر ہر وقت وہاں موجود ہوتے تھے۔ فیض احمد فیض بھی بیٹھتے تھے اس گھڑی وہ ادبِ لطیف کے ایڈیٹر بھی تھے۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: 1946ء میں، میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں گیارھویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ کالج کا پہلا سال ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی بھی تھے۔ تو ہم نے وہ گنگا جمنی دور بھی دیکھا ہے۔

نعیم طاہر: کیا غلام عباس بھی اُس زمانے میں لاہور تھے؟

حنیف رامے: غلام عباس دہلی میں مقیم تھے۔ جب اُنکی کتاب آنندی ہمارے ادارے سے چھپی تو وہ لاہور تشریف لائے اور ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: احمد ندیم قاسمی بھی؟

حنیف رامے: احمد ندیم قاسمی "انگہ" ضلع سرگودھا میں ہوتے تھے۔

نعیم طاہر: احمد ندیم قاسمی اور غلام عباس دارالاشاعت پنجاب سے بھی منسلک ہو گئے تھے۔

حنیف رامے: دارالاشاعت پنجاب سے بھی منسلک رہے۔ دراصل یہ اُن کا پہلے کا دور تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: دارالاشاعت پنجاب بہت نیک نام اور اچھا ادارہ تھا۔ یہاں سے ہمیشہ ہماری کلاسیکی اور بہت معیاری کتابیں شائع ہوئیں۔ اس ادارے سے بچوں کے لیے "پھول" کے نام سے اخبار نکلتا تھا۔
احمد ندیم قاسمی اور غلام عباس بھی اس سے وابستہ تھے۔

نعیم طاہر: اس دور میں ADOLF HITLER، BENITO MUSSOLINI اور تباہی و بربادی کے موضوعات پر بہت بات ہونا ابھی باقی ہے۔ لیکن میں چاہوں گا کہ اُس سے پہلے اس زمانے کی خوبصورت یادوں کے تار کو چھیڑا جائے۔
فلمی ہیرو، اداکار یا کوئی مصور جس نے آپ کو بہت متاثر کیا ہو؟

حنیف رامے: اس زمانے میں میرے فلم سے دلچسپی کم تھی۔ میرا زیادہ تر وقت کُتب بینی کی نذر ہوتا تھا۔ مجھے فُٹ بال کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ یقین جانیے آٹھویں جماعت میں، میں نے فسانہ آزاد کی چاروں جلدیں پڑھ لیں تھیں۔ ہزار ہا اشعار مجھے اَز بر تھے۔
16 فروری 1948 کو پاکستان کے وفاقی وزیر برائے مہاجرین راجہ غضنفر علی خان نے پاکستان کے پہلے فلم اسٹوڈیو "پنچولی" کا افتتاح کیا۔ اس اسٹوڈیو کے مالک سیٹھ دل سکھ تھے جو بہت جلد ہندوستان چلے گئے۔
لیکن میں فلم بھی دیکھتا تھا اور اس دور میں تو فلم ایک واقعہ تھی۔

نعیم طاہر: واہ دیکھنے جا رہے ہیں۔ ہاہاہا۔۔۔

حنیف رامے: فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔ اور گھر والوں کو اگر مہینے میں ایک فلم دکھائی جاتی تھی تو مہینہ بھر بیویاں خوش مزاج رہتی تھیں۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔۔۔

حنیف رامے: اور لڑکیوں کو فلموں کے تمام گانے زبانی یاد ہوا کرتے تھے۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

حنیف رامے: ریڈیو بھی ایجاد ہو چکا تھا اور ریڈیو کی ایک بہت بڑی سہولت تھی کہ اس پر گانے نشر ہوتے تھے۔ لوگوں کو فلموں کی مکمل کہانیاں یاد ہوتی تھیں اور وہ ایک دوسرے کو سنا دیا کرتے تھے۔

نعیم طاہر: عام طور پر شخصیت کے بہت سے خدوخال سکول کے زمانے میں ہی متعین ہو جاتے ہیں۔ زندگی میں انسان کے ابتدائی دوست معصومیت کے دور کے ہوتے ہیں۔ جب انسان کو کسی سے کوئی غرض اور واسطہ نہیں ہوتا۔ اپنے اس دور کے بارے میں بتایئے جس میں نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلے کی پرواہ تھی اور جن دوستوں کے کردار پوری زندگی آپ کے ساتھ ایک رہنما پرچھائیں کے طور پر آپ کے ساتھ چلتے رہیں؟

حنیف رامے: دیکھیں تھوڑا سا مجھے اپنے اندر فکری غوطہ خوری کرنا پڑ رہی ہے۔ جب ہم لاہور آئے، تو گزر اوقات کے لیے میرے بھائیوں نے ملازمت شروع کی۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ میرے بڑے بھائیوں کی قدر و منزلت ہم چھوٹے بچوں سے بہت زیادہ ہے ہر بات اُن کی حمایت میں کی جاتی تھی۔ ہم چھوٹے بچوں کے بارے میں تقریباً یہ تصور پیش کیا جاتا تھا کہ یہ جیسے کنبے پر بوجھ ہیں، تو کچھ اس طرح کا احساسِ محرومی پیدا ہوا کہ جیسے اس بہت سے بچوں والے کنبے میں، میں کوئی فالتو سا آدمی ہوں۔ اس احساس نے مجھے گھر سے باہر کی دُنیا دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ اور یہ موقع مجھے میرے ایک استاد نے مہیا کیا۔ یہ آٹھویں جماعت کا واقعہ ہے۔
ہمارے سکول کے استاد کا نام مولوی عبدالغفور صاحب تھا۔ وہ پٹھان تھے۔ فٹبال اور ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے فٹبال کے کوچ اور حساب کے اُستاد بھی تھے۔ ان کے ہاتھ میں ہر وقت چابیوں کا ایک بہت بڑا گچھا ہوا کرتا تھا۔ تو کمرہ جماعت کے اندر جہاں سے آہٹ آتی تو مولوی صاحب اپنا سیر بھر کا گچھا ایسے ٹھیک نشانے پر لگاتے کہ کبھی خطا نہ ہوتا۔ اُن سے ہر بچہ تھر تھر کانپتا تھا۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: اس زمانے میں جب سکول میں چھٹی ہوتی تھی تو چھٹی کا باقاعدہ سکول میں ایک نشہ آور شور ہوتا تھا۔

نعیم طاہر: او بالکل۔۔

حنیف رامے: گھنٹی بھی بجتی تھی لیکن کمرہ جماعت کے اندر چھٹ، ٹ، ٹ، ٹ، ٹ، ٹ، ی کا ایک نغمہ

Scanned with CamScanner

سا۔۔۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔۔

حنیف رامے: مولوی صاحب کمرہ جماعت میں، جیسے شیر پنجرے میں چلتا ہے، اُسی طرح چل رہے تھے بچوں کو حساب کا سوال حل کرنے کے لیے دیا ہوا ہے اور اچانک کمرہ جماعت میں ایک چیخ بُلند ہوتی ہے۔ چُھٹی۔۔۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔۔

حنیف رامے: اب وہ پلٹ کر دیکھتے ہیں اور استفسار کرتے ہیں کہ کون تھا؟ میں اپنی نشست سے کھڑا ہو جاتا ہوں (کیونکہ وہ بچہ میں تھا)

نعیم طاہر: آپ تھے؟

حنیف رامے: اب میرے ہم جماعتوں کا خیال یہ ہے کہ!

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پر تماشا نہ ہوا

آج تو کُچھ ہوگا۔

نعیم طاہر: ہاں سب تماشے کے انتظار میں تھے۔

حنیف رامے: وہ تماشے کے انتظار میں، اور میں ان کے اس حکم کا منتظر تھا کہ باہر جاؤ اور بید کی چھڑی سے پٹنے کے لیے ہاتھ نکالو۔

اُن کے پاس ہُک کے بغیر ہاکی کی ٹوٹی ہوئی چھڑی تھی۔ مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ اب میں بوڑھا ہو گیا اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ لچک دار ہونے کی وجہ سے مارنے والے کو کم چوٹ لگتی ہے۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔ مارنے والے کو

حنیف رامے: جی مارنے والے کو۔

نعیم طاہر: اور جس کی پٹائی ہو رہی ہے؟

حنیف رامے:

اُس کو تو بہت درد ہو رہا ہے۔

نعیم طاہر:

ہاہاہا

حنیف رامے:

تو میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب مجھے مرغا بنا کر میری کھال اُدھیڑیں گے۔ لیکن اُس دن خلافِ معمول وہ کمرہ جماعت کے چکر کاٹنے لگے۔ پھر میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے! آپ کتنے بھائی ہیں؟

میں نے کہا! جی پانچ بھائی۔

کتنے بڑے اور کتنے چھوٹے ہیں؟

میں نے کہا! جی تین بڑے بھائی اور ایک چھوٹا بھائی۔

فرمانے لگے میں تمھارے خاندان کو جانتا ہوں۔

مولوی صاحب پڑھنے لکھنے والے آدمی تھے۔ شاعر بھی تھے اور ''خلیق'' تخلص کرتے تھے۔ کبھی کبھار افسانہ بھی لکھتے، میں نے اُن کا ایک افسانہ ''ادبِ لطیف'' میں بھی پڑھا تھا۔

نعیم طاہر:

اچھا۔

حنیف رامے:

میں نے مولوی صاحب کی محبت میں اپنی سکول کی ٹیم کا نام ''خلیق کلب'' رکھا۔

نعیم طاہر:

اچھا۔

حنیف رامے:

مولوی صاحب کہنے لگے کہ ایک کام کرو، میری ایک درخواست اپنے والد صاحب کی خدمت میں پیش کرو کہ اللہ پاک نے اُنہیں پانچ بیٹے دِیے ہیں اور مجھے اِس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ اگر تمہارے والد، تُمھیں میرا بیٹا بنا دیں تو میں بہت شُکر گزار رہوں گا۔

مولوی صاحب کی زبان سے یہ باتیں سُنتا نہ صرف میرے لیے بلکہ میرے ہم جماعتوں کے لیے بھی ایک کرشمہ تھا۔

نعیم طاہر:

حیرت انگیز بات تھی۔

حنیف رامے:

جی تعجب خیز بات تھی۔ میں نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے والد صاحب کو بتایا۔ اگر چہ میرا خیال ہے اُنہیں میری کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔

نعیم طاہر:

ہاہاہاہا۔

حنیف رامے:

میرے والد صاحب نے کہا کہ پالا پوسا لڑکا اب اُن کو دینا خارج از امکان ہے۔ مولوی صاحب کا شکریہ ادا کر دینا اور کہنا ایسا ناممکن ہے۔

نعیم طاہر:

اے پُتر ہٹاں تے نئ وکدے۔

حنیف رامے:

جی۔ اے پُتر ہٹاں تے نئ وکدے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے مشکل ترین لمحات میں اِس ایک واقعہ نے میری ہمیشہ ڈھارس بندھائی۔

نعیم طاہر:

اس واقعہ سے، والد صاحب کا آپ کے بھائیوں کے ساتھ مشفقانہ رویے کے حوالے سے آپ جس احساس کمتری کا شکار ہو رہے تھے اس میں ضرور کمی واقع ہوئی ہوگی۔

تو اور یہ بھی احساس ہوا کہ ایک جانب اُستاد جیسی عظیم ہستی آپ کو اپنی فرزندی میں لینا چاہتا ہے اور دوسری طرف والد محترم اپنے لال کو اپنی نگاہوں سے ایک پل کے لیے بھی اوجھل نہیں کرنا چاہتے۔

حنیف رامے:

میں سمجھتا ہوں کہ میرے اور میرے والد صاحب کے رَبط میں زندگی پھر ایک کشمکش رہی۔ جب وہ میرے دادا سے رنجیدہ ہو کر شہر چلے آئے تو وہ احساس محرومی کا شکار ہو گئے۔ ان حالات میں جو بچے کسبِ معاش کا وسیلہ تھے، میرے والد ان کو ہی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

نعیم طاہر:

صحیح۔

حنیف رامے:

اور جو بچے ابھی کُچھ کرنے کے قابل نہیں تھے، اُن کی مرمت بھی کی جاتی، لتاڑا بھی جاتا اور رگیدا بھی کرتے اور اِن کاموں میں وہ کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے۔

نعیم طاہر:

ہاہاہاہا۔

حنیف رامے:

میرے ساتھ والد صاحب کا ایک پسندیدہ مذاق بھی تھا۔ کہ تمہارے سارے بھائی خوبصورت ہیں اور تمہارے چہرے کی کسی سے بھی مشابہت نہیں ہے تمہاری تو وضع قطع ہی اور طرح کی ہے۔ اور میں آئینے کے سامنے بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ اِس صورت کے ساتھ میں کیسے گھر سے باہر جاؤں۔

مجھے باہر نکالا میرے اُستاد صاحب کے دستِ شفقت نے، میرے اندر خود اعتمادی پیدا کی میرے قریبی دوستوں نے اور اُن کی محبت آمیز دوستی نے۔ وہ میرے سکول کے زمانے کے غم خوار تھے، اور مجھے احساس ہوا کہ گھر کے کُنبے سے باہر بھی ایک دنیا آباد ہے۔ آہستہ آہستہ تعلیمی سلسلہ بھی آگے بڑھتا گیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا کہ پنجاب بک ڈپو، مکتبہ اردو ادب لاہور، اور مکتبہ جدید لاہور میں آنے والے بر صغیر کے نامور دانشوروں ادیبوں سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا۔

اُن کی جب کبھی میرے والد سے ملاقات ہوتی تو وہ کہتے اس لڑکے کا خیال رکھیئے گا اس نے کُچھ بننا ہے۔

نعیم طاہر:

اچھا۔

حنیف رامے:

اب کہیں والد صاحب کے دماغ میں ایک نیا خیال آ گیا کہ اس نے کُچھ بننا ہے اب کچھ کچھ میری قدر ہونے لگی۔

میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے اکنامکس کیا۔ اُس دور میں جو لڑکا گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے اکنامکس کی ڈگری حاصل کر لیتا تھا اُس کے لیے ورلڈ بینک سے لے کر اسٹیٹ

بینک تک کے دروازے کُھل جاتے تھے۔ میرے بہت سے دوستوں سے انہیں بینکوں میں ملازمت اختیار کی۔

نعیم طاہر:

اچھا۔

حنیف رامے:

معین بقائی، ڈاکٹر پرویز حسن، بندیال صاحب اور معین الدین احمد قریشی یہ سب میرے ہم جماعت تھے۔

نعیم طاہر:

فتح خان بندیال؟

حنیف رامے:

جی۔ فتح خان بندیال۔ تو صورت حال یہ ہوئی کہ میں نے اپنے والد محترم سے کہا کہ میں نے آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایم۔اے اکنامکس کیا ہے۔ کیونکہ آپ چاہتے تھے کہ آپ کے ایک بھائی نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کیا ہے اور اب آپ کم سے کم ایک بیٹا اس ادارے سے ایم۔اے ضرور کرے۔

تو یہ لیجیے میری ایم۔اے اکنامکس کی ڈگری۔

نعیم طاہر:

ایم۔اے کی ڈگری۔ہاہاہا۔۔۔

حنیف رامے:

اور ہم تو پہن کے کھڑاویں، بن چلے ہیں مصور۔

نعیم طاہر:

ٹھیک۔

حنیف رامے:

اس زمانے میں استاد اللہ بخش مسلم ٹاؤن مزنگ میں رہائش پذیر تھے اور میں گھر سے پیدل سفر طے کر کے ان سے مصوری کی تعلیم حاصل کرنے جاتا تھا۔

نعیم طاہر:

استاد اللہ بخش کے پاس۔

حنیف رامے:

دراصل، میں عبدالرحمن چغتائی کی شاگردی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ عبدالرحمن چغتائی نے اپنے بڑے بھائی سے مشورہ کرنے کے بعد مجھے کہا کہ:

دیکھو بھئی میرا کام ایک خاص انداز کا ہے۔ میں بنگال سکول آف آرٹ (Bengal School of Art) کو ایک خاص طرز میں ڈھال کر کام کرتا ہوں۔ تم پہلے لینڈ سکیپ (LAND SCAPE) اور (HUMAN FIGURE) وغیرہ کیا ہوتا ہے؟ اس لیے تم پہلے استاد اللہ بخش صاحب کے پاس جاؤ۔

اب کُبا یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب اُمید لگائے ہوئے تھے کہ یہ لڑکا ایم۔اے اکنامکس کر کے تو بہت بڑا بینک کا افسر بنے گا، لیکن اس نے مصور بننے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے 1952ء میں ایم۔اے اکنامکس کیا۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: یقین جانیے وہ بہت سستا زمانہ تھا۔ میرے بھائیوں نے مجھے ایک نوکری کی پیشکش کر دی کہ پچاس روپے ماہوار پر ہماری مہینے بھر چھپنے والی کتابوں کا سرِ ورق بنا دیا کرو۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔ہاہاہا۔

حنیف رامے: یہ اُس دور کے لوگ تھے جب اُنہوں نے اپنی نوکری کا آغاز پندرہ روپے ماہوار سے کیا تھا۔ تو پچاس روپے دیتے ہوئے انہیں فراخ دلی سے کام لیتا تھا۔

نعیم طاہر: ہاں جی۔

حنیف رامے: پس اس شرمیلے اور افسردہ طبع لڑکے نے اپنے فن سے اور ایک نئی دنیا سے مضبوط رشتہ استوار کر کے خود کو اپنے قدموں پر کھڑا کر دیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: البتہ آپ نے بھی وہ بہت خوب بات کہی تھی کہ آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ بظاہر سخت مزاج والد محترم کا دل، موم کی مانند نرم تھا۔

Scanned with CamScanner

ایک بار میں نے اُنہیں اپنی والدہ صاحبہ کے پاس بیٹھے زار و قطار روتے دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ اس لڑکے نے میری کمر توڑ دی۔ میں تو اس سے بہت امیدیں لگائے بیٹھا تھا۔

اُمیدوں کا بھی والدِ محترم نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا بظاہر تو خار دار شخصیت تھی لیکن آپ کو علم ہے کہ گُلاب کی ٹہنیوں پر ہی کانٹے ہوتے ہیں۔ والد صاحب ہم سے دل سے، بہت محبت کرتے تھے۔

نعیم طاہر: اس زمانے میں والدین کا یہ معیاری طرزِ عمل سمجھا جاتا تھا کہ بچوں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔

حنیف رامے: والدین بہت شرم محسوس کرتے تھے، اپنے مُنہ سے اپنی اولاد کی تعریف کرتے ہوئے۔

نعیم طاہر: میرے بہت سے دوستوں اور اُنہیں کے ہم عُمر میرے بڑے بھائی کا بھی یہی تجربہ ہے کہ اُس دور میں ماں باپ والدانہ رویہ رکھتے تھے۔ ہاہاہا۔

حنیف رامے: والدین کے اظہارِ محبت کا یہی انداز تھا۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔

حنیف رامے: جب ہم گاؤں سے شہر منتقل ہوئے تو زندگی میں پہلی بار اتنی مُفلسی دیکھی۔ جیسے آج کل جب لوگ بیرونِ مُلک سے آتے ہیں تو چور اور ڈاکو خاص کر اُن کی گھات میں لگے رہتے ہیں کہ وہ ضرور اپنے ہمراہ مال و دولت بھی لائے ہونگے۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

حنیف رامے: لاہور میں ہمارے خستہ مکان میں بھی واردات ہوگئی۔ اِس امید پہ کہ چودھری صاحب گاؤں سے اپنے لڑکوں کو شہر پڑھانے لائے ہیں۔ نہ جانے کتنا مال و زَر ساتھ لائے ہوں گے۔ ہمارے پاس اتفاق سے جو کُچھ رہ گیا وہ سب لے گئے۔

نعیم طاہر: وہ بھی لے گئے۔

حنیف رامے: اگلی صبح میرا امتحان تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: گرمیوں کا موسم تھا۔ جب ہم صُبح اٹھے تو میرے پاس صرف ایک ہی نیکر تھی۔ جو میں نے پہنی ہوئی تھی۔ جسے آپ جانگیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: اور میری قمیص چوری ہو چکی تھی۔ میری والدہ صاحبہ بھاگم بھاگ بازار سے کپڑا خرید کر لائیں اور

جلدی سے قمیص سلائی کی۔ جبھی تو میں امتحان دینے کے لیے گیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ قمیص کا کالر نہیں تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: آج تو میں نے کالر کے بغیر قمیض اپنی مرضی کے موافق پہنی ہے۔

میری والدہ نے کہا کہ وقت نکلا جا رہا ہے یا تم امتحان دے پاؤ گے یا قمیض کا کالر لگایا جا سکتا ہے۔

میرے اندر ایک شورش برپا تھا کہ نہ جانے لوگ کیا سوچیں گے کہ میں کالر کے بغیر قمیض پہنے ہوئے ہوں۔ بہرکیف یہ ہماری غُربت و تنگدستی کا احوال تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: میں نے اپنے گھر ایک اور رُخِ حیات بھی دیکھا۔ میرے والد صاحب کے بڑے بزرگ لاہور کے پرانے باسی اور زمینوں کے مالک تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان زمینوں کی مالیت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میرے والد صاحب کے باپ دادا کا شمار لاہور کے کھاتے پیتے گھرانوں میں سے تھا۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

حنیف رامے: میری والدہ کا تعلق جالندھر سے تھا۔ ہمارے گاؤں کے کسی مزار نے میرے والدین کا رشتہ طے کروایا تھا۔ میرے دادھیال کا میری والدہ سے برتاؤ اچھا نہیں تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: یہاں تک کی میرے والدِ محترم بھی وقتاً فوقتاً اُن پر ہاتھ اٹھاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے میں تقریباً دس برس کا ہوں گا، کہ میرے والدِ محترم، میری والدہ صاحبہ کو مارنے کے لیے جیسے ہی آگے بڑھے۔ کمرے میں ایک لاٹھی پڑی تھی میں نے فوراً وہ لاٹھی اُٹھائی اور اُن دونوں کے بیچ کھڑا ہو گیا اور اپنے والد سے کہا ”آپ میری ماں کو ہاتھ تو لگا کے دکھائیں“ میری یہ بات سُن کر والد صاحب نے بہت پیچ و تاب کھایا اور کہنے لگے کہ: ”میں تمھیں ایک تھپڑ ماروں گا اور تم مر جاؤ گے۔“ میں نے کہا: جی ماریں لیکن میں ہٹوں گا نہیں، آپ ہٹا لیں۔ غرض یہ ہوا کہ میری اس جرأت کے بعد میرے والد نے اپنی باقی ماندہ زندگی میں کبھی بھی میری والدہ پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

Scanned with CamScanner

حنیف رامے: ایک بار گاؤں میں میرے والد نے ایک آدمی کو تھپڑ مارا اور وہ مَر گیا۔ وہ بڑی دُشواری اور مشکل سے اس مقدمے میں جیتے تھے۔ یہ کہہ کر کہ یہ سب نادانستگی میں ہوا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: اس روز دو فیصلے ہوئے کہ میرے والد چوہدری ہیں اور میری ماں ''رام'' ہیں۔ تو یہ طے پایا کہ میں رام ہوں چوہدری نہیں۔ دوسرا مجھے اس حقیقت کا اِدراک ہوا کہ اگر حق بات لیے کھڑا ہو جائیں تو حق متعین بھی ہو جاتا ہے۔

نعیم طاہر: ہو جاتا ہے۔

حنیف رامے: اسی ایک بات نے میرے وجود میں سیاست سے دِل بستگی کا بیج بو دیا تھا اور اس بیج کی آبیاری اُس ترقی پسند ادب نے کی جو اُس زمانے میں مکتبہ اردو ادب لاہور سے چھپ رہا تھا۔ اس کے مصنفین میں باری علیگ، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی کے نام شامل ہیں۔ ایک نئی فکر ادبی فضا میں نمو پا رہی تھی۔ انہوں نے اشتراکیت سے متعلقہ تمام کتابیں بھی ترجمہ کروائیں۔
عجب اتفاق ہے کہ جب میں کلاس میں اوّل آیا تو میرے سکول کے اُستاد عبدالغفور صاحب نے بھی مجھے دو کتابیں تحفے میں دیں۔ ایک انقلاب روس اور دوسری کتاب کارل مارکس (CARLMAX) کی زندگی پر مبنی تھی۔

نعیم طاہر: اوہ اچھا۔

حنیف رامے: ان تمام حالات و واقعات سے میرے اندر یہ احساس پنپنے لگا کہ میں غریب عوام کے ساتھ ہوں اور مجھے اُن کے معاشی و معاشرتی استحقاق کے لیے سیاست کرنی ہے۔ پاکستان کی تحریک کا بھی یہی مقصد تھا۔ اگرچہ اب لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان اِسلام کے نام پر بنا جبکہ اس دور میں اسلام سے زیادہ مسلمانوں کی بات ہوتی تھی۔ قائداعظم نے بھی کبھی انڈیا کی بجائے مُسلم انڈیا کہا۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف رامے: قیامِ پاکستان کا مقصد اسلامی ریاست کا قیام تھا اور یہی عام آدمی کا نکتہ نظر تھا کہ مسلمانوں کے لیے اسلامی ریاست بننے والی ہے اور پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اِلا اللہ۔ اب میرے لیے پریشانیٔ خاطر یہ بات تھی کہ غریبوں کی حمایت اور اسلامی انقلاب کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ اس سوال نے بعد مُجھ سے لگان وصول کیا۔ جب میں اپنے بھائیوں کے ساتھ کاروبار میں حصے دار بنا اور مکتبہ

جدید لاہور کے ڈائریکٹر کے عُہدے پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ ''سویرا'' اور ''نصرت'' کا ایڈیٹر بھی تھا تو میرے دل میں ایک سوال اُٹھا کہ ''تم نے لائبریریاں پڑھ ڈالیں لیکن تین چار سو صفحے کی خدا کی کتاب پڑھنے کا ارادہ باندھ لیا۔''
اِس ضمن میں دو بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کا نام لینے میں بھی کیا حرج ہے۔

نعیم طاہر: کوئی حرج نہیں۔

حنیف رامے: مولانا غلام احمد پرویز صاحب اور مولانا غلام مرشد صاحب۔ میں نے اُن دونوں بزرگوں سے گزارش کی کہ میں آپ کے گھر میں نوکر بن کر رہنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ مجھے قرآن مجید پڑھا دیجیے۔ کتاب کا حق تو جبھی ادا ہوتا ہے جب اُسے حرف بہ حرف تسلسل کے ساتھ پڑھی جائے۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف رامے: قرآن پاک میں بیان کیے گئے ابتدائی حصے کے مضامین اپنی بصیرت آخر میں ظاہر کرتے ہیں یہ قرآن کے کلی نظام ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف رامے: ان بزرگوں نے میری درخواست قبول نہیں کی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

میں نے کہا: جی۔
بیگم صاحبہ کیا کریں گی؟ میں نے کہا: میری بیگم نے ایم۔اے فلسفہ کیا ہے۔ اُن کی گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں بطور لیکچرر تقرری ہوگئی ہے اور جب تک میں قرآن پاک کی تعلیم مکمل نہیں کر لیتا وہ کوئٹہ میں ہی رہائش پذیر ہوں گی۔

نعیم طاہر: اب اس میں ایک اور اہم بات شامل ہوگئی ہے۔ یہ 1955ء کی بات ہے جب آپ نے ایم۔اے فلسفہ میں داخلہ لیا تھا۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔

حنیف رامے: اور آپ میرے ہم جماعت تھے۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔

نعیم طاہر: آپ میرے ہم جماعت تھے۔

حنیف رامے: جی ہاں۔

نعیم طاہر: اور آپ کی بیگم صاحبہ بھی۔

حنیف رامے: جی۔

نعیم طاہر: شاہین بھی ہماری ہم جماعت تھی۔

حنیف رامے: اور وہی زمانہ ہے جب ہماری محبت و آشتی کا آغاز ہوا۔ پھر اُنہوں نے مجھ سے ضِد کی کہ "تم نے اچھا بھلا ایک ایم۔اے کر رکھا ہے تم یہاں سے چلے جاؤ اگر تم یہاں رہے تو ہم دونوں فیل ہو جائیں گے"۔۔۔ہاہاہاہا۔۔۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔تو پھر آپ دونوں پاس ہو گئے۔

حنیف رامے: جی پاس ہو گئے۔ جب ان دونوں بزرگوں نے پڑھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "تمہیں پڑھانے کا مطلب ہے کہ ہم جو دس بارہ آدمیوں کو پڑھاتے ہیں اُن کو نہ پڑھائیں کیونکہ تمہیں تو ہمیں بھرپور توجہ اور وقت دینا پڑے گا۔"

میں نے شاہین کے ساتھ کوئٹہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنا مشترکہ کاروبار بغیر کسی حساب کتاب کے اپنے بھائیوں کے حوالے کیا۔ اُن کی مہربانی ہے کہ پھر بھی میرے لیے گنجائش رکھی۔ اپنی والدہ کو اور پیارے شہر کو چھوڑ کر ہم کوئٹہ چلے گئے۔ یہ 1961ء تا 1963ء کی بات ہے۔ میں نے F.A میں کالج میں عربی کا مضمون پڑھا تھا اس بنا پر عربی زبان سے کُچھ واقفیت تھی۔ قرآن مجید مولوی صاحب سے حرف بہ حرف دوبارہ پڑھا۔

قرآن مجید کی تمام تفاسیر سرسیّد سے لے کر ابوالاعلیٰ مودُودی تک، سب پڑھ ڈالیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: دوبارہ قرآن پاک پڑھا۔ بلند آواز میں بھی پڑھتا تھا۔ کیونکہ A.J Arberry کا کہنا ہے کہ قرآن کے معانی صرف اُس کی لغت میں ہی پنہاں نہیں ہیں بلکہ اُس کی قرأت میں بھی افشاء ہیں۔ اسی لیے پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ لفظ قاری اور قرأت اسی سے اشتقاق ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب میں قرآن مجید پڑھنے کے لیے کھولتا تو قرآن پاک مجھے کہتا بس ۔۔۔یہ کیفیت میرے اندر۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: اس کیفیت دل نے مجھے نہایت مُضطرب کر دیا۔ میں نے تو قرآن پاک کے تفکّر اور غور و فکر کی گہرائی میں سفر کے لیے دس برس کا عرصہ مختص کر رکھا تھا۔ میرے ایک بہت عزیز دوست شیخ صلاح الدین تبحّرِ علمی کا سرچشمہ تھے۔ وہ میرے دوستوں ناصر کاظمی، مظفر علی سید، انتظار حسین، غالب احمد، احمد مشتاق اور منیر نیازی کے بھی دوست تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ لاہور جا کر اُن سے اپنی اس عالمِ بے خودی کا مُدعا بیان کرتا ہوں۔ اس غرض سے لاہور اپنی ہمشیرہ کے گھر پہنچا تو اُن کے میاں صاحب مجھے ریگل چوک تک لے گئے وہاں سے میں پیدل شیخ صلاح الدین کے دفتر لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ کی سمت جا رہا تھا۔

نعیم طاہر: یہ وہی Lahore Improvement Trust کا دفتر ہے جو YMCA (Young Men Christian Association) کے مقابل عمارت کے بالائی حصے پر ہوتا تھا۔

حنیف رامے: جی بالکل، اور جب میں پنجاب کا وزیرِاعلیٰ بنا تو اس ادارے کو ایل ڈی اے Lahore Development Authority میں تحویل کر دیا۔ میں اس سوچ میں گُم چلتا جا رہا تھا کہ کیسے اپنی سَر بیتی اُن کے گوش زد کروں۔ جیسے ہی ہائیکورٹ کے قریب پہنچا تو مجھے کشف ہوا، اور اس نے مجھے کہا کہ " قرآن پاک آپ سے یہ کہہ رہا ہے کہ پڑھنا تو ہے لیکن اس پر عمل پیرائی بھی واجب ہے اور عمل کی توفیق اللہ سے مانگو"۔ یہیں آدھ گھنٹہ تک ایک درخت کے نیچے عالمِ استغراق و محویت میں کھڑا رہا، اور یہ فیصلہ کیا کہ شیخ صلاح الدین سے دِل کا حال نہیں کہنا۔

اُن سے چائے پیئں گے اور کتابوں پر تبادلۂ خیال ہوگا۔

اس واقعہ کے بعد میں نے اللہ سے دُعا مانگی کہ "میں حاضر ہوں آپ عمل کی راہیں عطا کیجئے"۔

میں اسی کیفیت میں کوئٹہ چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد میرے بھائیوں نے مجھ سے گذارش کی کہ رسالہ "نُصرت" کے بانی آپ ہیں تو ہر ماہ اس کا اداریہ (EDITORIAL) لِکھ دیا کریں۔ دوسرا ہماری کتابوں کے سرِ ورق اب بھی آپ ہی بنا دیا کریں تو اب ہم پچاس کی بجائے دو سو روپے معاوضہ دیں گے۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

حنیف رامے: تین سو روپے اس زمانے میں لیکچرار کی تنخواہ تھی۔ شاہین کو تین سو روپے اور مجھے دو سو روپے ملتے تھے۔

آپ یقین جانیے ایسی آسودہ حال زندگی کبھی نہیں گزاری تھی۔

بات یہ ہے نعیم! میری زندگی میں دو چیزوں کی آمیزش رہی۔ ایک طرف یہ کہ میں نے دیہاتی اور

شہری زندگی دیکھنے کے ساتھ ساتھ غربت میں زندگی کے بے آب وگیاہ صحرا کو اپنی جانفشانی اور تگ ودو سے نخلستان میں بھی بدلتے دیکھا۔ دوسری جانب ادب اور آرٹ کی تحریکوں سے بھی وابستہ رہا اور اسلام سے آشنائی کے لیے میں نے قرآن پاک کو اس طرح سے پڑھنے کی کوشش کی جیسا کہ اُس کا حق ہے۔

علوم کائنات کے تمام تر چشمے جس زرم زمین سے پھوٹتے ہیں ان سب کے اصل سوتوں کو مرکز قرآن ہے۔ اور میں اس چشمے کے ابھی ایک قطرے سے شناسا ہوا ہوں۔ اور اپنے وطن کی مٹی کی ہر رَمز سے بھی واقف ہوں۔ تو شاید اب مسلم لیگ میں بطور سیکرٹری اطلاعات (Information Secretary) شامل ہونے کی دعوت ملی تو مجھے فوراً وہ بات یاد آئی کہ جب میں قرآن پاک پڑھنے کے لیے کھولتا تھا تو وہ مجھے عمل کی بھی تاکید کرتا ہے۔ تو میں نے سوچا کہ عمل کا وقت آگیا ہے اور یہ دعوت بھی اِسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

نعیم طاہر: تو آپ نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اِس وقت کو صحیح جانا۔

حنیف رامے: اس وقت بھٹو صاحب، جنرل ایوب خان کی سیاسی جماعت کنونشن مسلم لیگ (Convention Muslim League) میں سیکرٹری اطلاعات (Secretary Information) تھا۔

اسی دوران میرا بھٹو صاحب سے خط وکتابت اور بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں اسلام اور اشتراکیت (Socialism) دونوں کا طالب علم تھا۔ جب پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے اس منشور کا اعلان کیا کہ اسلام ہمارا دین ہے۔ جمہوریت ہماری سیاست ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے تو اس سے پہلے میرے اخبار ''نصرت'' کے ذریعے اسلامی اشتراکیت (Islamic Socialism) کا چرچا ہو چکا تھا۔

جب بھٹو صاحب نے جنرل ایوب خان اور ان کی سیاسی جماعت سے علیحدگی اختیار کی تو میں نے بھٹو صاحب سے پہلی ملاقات میں ہی اپنی سیاسی جماعت بنانے کی درخواست کی۔

بھٹو صاحب نے کہا کہ سیاسی جماعت بنانا بہت مشکل کام ہے۔ میں نے کہا بالکل دُشوار کام نہیں۔

بھٹو صاحب نے کہا! کہ ہم سیاسی جماعت کسی نظریہ کی بنیاد پر بنائیں؟

میں نے کہا! عرب کی دنیا میں انقلاب کے بانی جمال عبدالناصر نے اشتراکیۃ الاسلامیہ (Islamic Socialism) کا نظریہ دیا تھا۔ قائداعظم نے اپنی تقاریر میں اور علامہ

اقبال نے اپنے خطوط بنام قائداعظم میں، تشکیل پاکستان کے ضمن میں اس نظریہ کی حمایت کرنے کی تاکید کی۔ لیاقت علی خان جب پہلی بار امریکہ گئے تو اپنی تقاریر میں بارہا کہا کہ پاکستان اسلامی اشتراکیت (Islamic Socialism) کی بنیاد پر آگے بڑھ سکتا تھا۔

میں نے کہا! ہمارے پاس دلائل اور ثبوت موجود ہیں انہیں بنیادوں پر ہم ایک نئی سیاسی جماعت بنا سکتے ہیں۔

نعیم طاہر: اب یاد رفتہ ہو جائے میں کچھ بات قیام پاکستان کے حوالے سے کرنا چاہ رہا ہوں۔ اُس وقت سیاسی افق پر جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، موہن داس کرم چند گاندھی، قائداعظم محمد علی جناح، ابوالکلام آزاد، لیاقت علی خان جیسے بہت سے لیڈر نمایاں تھے۔ ایک کشمکش کی فضا تھی لیکن جیسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن آئے تو پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا۔

جس انداز سے پاکستان قیام عمل میں آیا اُس کے بارے میں کئی مختلف آراء ہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح کابینہ مشن پلان (Cabinet Mission Plan) کی حمایت میں تھے اور اس کی بہت طرف داری کی۔

حنیف رامے: جی۔

نعیم طاہر: آزادی کے بعد جو پاکستان، دُنیا کے نقشے پر نظر آیا قائداعظم محمد علی جناح اس سے مطمئن نہ تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو صوبے پاکستان کا حصہ بنے وہ آزادی کی تحریک میں پیش رو نہیں تھے۔

چنانچہ اُس دور میں آپ آزادی کی اس تحریک کے عینی شاہد بھی ہیں تو قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کے علاوہ کسی اور شخصیت نے بھی آپ کو متاثر کیا؟

حنیف رامے: میں انجمن حمایت اسلام کے ایک سکول، گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ پڑھتا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کے سکول، کالج اور یونیورسٹی قائداعظم کے ساتھ تحریکِ پاکستان میں پیش پیش تھی۔ چنانچہ جب 1946ء میں اسلامیہ کالج کے میدان میں قائداعظم کا جلسہ ہوا تو ہمارے سکول کے طالب علم بھی بڑے جوش وخروش سے جلسہ گاہ پہنچے۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے ان کی تقریر حرف بہ حرف نقل کی۔ یُوں سمجھ لیجئے کہ یہ میرا پہلا صحافیانہ عمل ہوگا۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔ تو قائداعظم نے آپ کو صحافت کی راہ پر گامزن کر دیا۔

Scanned with
CamScanner

حنیف رائے: تحریک خاکسار کے بانی علامہ مشرقی بھی اپنے سپاہی کارکنوں کے ہمراہ جلسہ گاہ تشریف لائے۔ علامہ مشرقی کی وہاں سے واپسی کا اعلان ہونے پر ہنگامہ برپا ہو گیا اور جلسہ کچھ دیر کے لیے التوا میں پڑ گیا۔ پھر کچھ لوگوں نے علامہ مشرقی اور ان کے خاکساروں کو وہاں سے روانہ کیا۔ یعنی آزادی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا خاتمہ ہو رہا ہوں۔ بالخصوص ہندو مسلم تصادم کے سبب گاندھی اور جناح صاحب کا بار بار تقابل کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے لوگ گاندھی صاحب کے بارے میں جو بھی رائے رکھیں لیکن مجھے اس بات کا ادراک ہے کہ جس طرح آج کے دور میں بڑے بڑے شہنشاہوں اور امریکی صدور کے ہوتے ہوئے بھی نیلسن منڈیلا کو سب سے زیادہ باوقار اور ذی مرتبہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح دنیا میں گاندھی بھی بہت نامور ہے۔

نعیم طاہر: بالکل۔

حنیف رائے: ہم اس وقت مذہب پرستی یا تعصب کا شکار ہونے کے باعث گاندھی کی شخصیت کو پرکھ نہ پائے۔ ہم نے گاندھی کو صرف قائداعظم کا حریف جانا اور ہمارے دوست یا رہنما کا دشمن ہمارا بھی دشمن ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رائے: ہمیں موہن داس کرم چند گاندھی، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد اور علامہ مشرقی نامرغوب تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں جواہر لال نہرو کی شخصیت سے اس وقت متاثر ہوا جب اس نے بطور وزیراعظم ہندوستان میں جدید طرز پر اداروں اور صنعتوں کی بنیاد رکھی۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رائے: پاکستان اپنے قیام کے بعد گیارہ برس تک جس سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا وہ جنرل ایوب خان کے لگائے ہوئے مارشل لاء کے دور میں استحکام پذیر ہوا۔ حتیٰ کہ جواہر لال نہرو بھی یہی بات کہنے پر مجبور ہوا کہ "پاکستان میں کس سے بات کروں، میں دن میں اتنی بار تہبند نہیں بدلتا جتنی بار پاکستان میں حکومت بدل جاتی ہے۔"

یہ الگ ماجرا ہے کہ جواہر لال نہرو مرتے وقت ملول و مغموم تھا۔ کیونکہ اس کا انڈیا کو ایک غیر جانبدار ملک بنانے اور ہندو اور چینی آپس میں بھائی بھائی کا خواب 1962ء میں ادھورا رہ گیا۔

نعیم طاہر: قیام پاکستان کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ڈائری سمیت اہم قانونی دستاویز جب منظر عام پر آئے تو اس میں کچھ من و عن اشعار بھی میری نظر سے گزرے۔ جیسا کہ آپ نے بھی کہا کہ پاکستان کے لوگ گاندھی کو ناپسند کرتے تھے، جبکہ گاندھی نیک دل آدمی تھا اور قائداعظم کی دل سے عزت کرتا تھا۔

حنیف رائے: جی وہ ہمیشہ جناح صاحب کے ساتھ عزت سے پیش آتا تھا۔

نعیم طاہر: اور یہ دونوں بڑے صاحب تدبر لیڈر تھے، لیکن شاید گاندھی سیاسی رہنما سے زیادہ سماجی رہنما تھے۔ ان کی شخصیت بہت بااثر و رسوخ تھی۔ یہ دونوں رہنما خطے میں امن و امان کے خواہاں تھے تاکہ دونوں قومیں صلح و آشتی سے رہ سکیں۔

حنیف رائے: بیشک، قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی میں ایک دن ایسا آیا جب انہوں نے براہ راست کارروائی کا اعلان کیا۔ ورنہ انہوں نے ساری زندگی اپنی آزادی کی جنگ قانون کے ذریعے لڑی اور فاتح بھی قرار پائے۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

حنیف رائے: اسی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے کہ انہوں نے ہمیشہ لٹھ کے راستے سے اجتناب برتا اور قانون کا راستہ اختیار کیا۔ وہ انگریز کے رمز شناس تھے اور وہ جانتے تھے کہ انگریز کو شکست دینے کے لیے قانون سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں۔

لیکن افسوس، صد افسوس جس قائداعظم نے اپنی انتھک قابلیت اور عوام کی معاونت و حمایت سے پاکستان بنایا، اسی قائداعظم محمد علی جناح کے پاکستان میں آج اگر کسی کی عزت و حرمت نہیں ہے تو وہ "آئین و قانون" ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل، عزت نہیں ہے۔

حنیف رائے: اگر دیکھا جائے تو گاندھی نے پاکستان کی خاطر جان کی قربانی دی، کیونکہ اگر آج بھی گاندھی کے قاتل نتھو رام گوڈسے پوچھیں کہ تم نے گاندھی کو کیوں مارا؟؟ تو وہ آپ کو یہ جواب دے گا کہ گاندھی پاکستان کی حمایت میں بات کرتے تھے۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رائے: گاندھی اس بات پر مصر تھے کہ اثاثوں کی تقسیم میں پاکستان کو اس کا حصہ دیا جائے۔ 1946ء میں

گاندھی ستم کشیدہ مسلمانوں کی مدد کے لیے بنگال، کلکتہ اور نواکھلی (NoaKhali) کا دورہ کر رہے تھے۔ گاندھی کو محض مسلمانوں کی دست گیری کے جُرم میں قتل کر دیا گیا جبکہ آج بھی پاکستان کا بچہ بچہ گاندھی کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ ایک طویل فہرست ہے۔ جنہوں نے گاندھی سے متاثر ہو کر اس نظریے کی حمایت میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں Hanry David Thoreau ، لیو ٹالسٹائی LeoTolstoy، مارٹن لُوتھر Marin Loother King ، جارج برناڈ شاہ George Bernad Shaw اور باچا خان Bacha Khan کے نام سرفہرست ہیں۔

گاندھی سے پہلے بھی اس نظریے کے شواہد موجود ہیں۔

نعیم طاہر: جیسا کہ آپ نے یہ بات بھی کہی کہ وقتِ مرگ گاندھی بھی شکستہ دل تھے۔

حنیف رامے: لیکن نہرو مرتے وقت زیادہ مایوس دِل تھا۔

نعیم طاہر: ماؤنٹ بیٹن نے اپنی ڈائری میں ایک بہت دلچسپ بات لکھی کہ گاندھی نے ایک موقع پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ قائداعظم کو متحدہ ہندوستان کا وزیراعظم ہونا چاہیے اور جب قائداعظم نے یہ بات سُنی تو وہ مُسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی پہلی میٹنگ میں ہی گاندھی کی یہ درخواست مسترد ہو جائے گی۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ بھی لکھا کہ ہندوستان میں اقتدار کی ڈور گاندھی یا نہرو کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس کا اختیار سردار ولبھ بھائی پٹیل اور اُس کے ساتھیوں کے پاس ہے۔

جن کے متعصبانہ رویوں کی بنیاد پر تقسیم کا منصوبہ خون آلود ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی اور جواہر لال نہرو کی پشتی بانی قوتیں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئیں۔

حنیف رامے: یہ بہت افسوس ناک بات ہے۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس قائداعظم محمد علی جناح جیسا عظیم لیڈر موجود تھا۔

گاندھی صاحب تو قیام پاکستان کے فوراً بعد وفات پا گئے۔ لیکن مرنے سے قبل جواہر لال نہرو کی صورت میں ہندوستان کو ایک بہترین تحفہ دے گئے۔

وہ سترہ بار انتخابات کے نتیجے میں وزیراعظم منتخب ہوئے۔ اس سے بھارت کا الیکشن کمیشن مضبوط ہوا۔ اس کے برعکس پاکستانی سیاست میں کئی بحران سامنے آتے رہے۔ کبھی فوج براہ راست اقتدار میں رہی اور کبھی بالواسطہ۔ کئی منتخب حکومتیں اپنی مدت مکمل نہ کر پائیں۔

قائداعظم کے معتمد سپاہی ہونے کے باوجود لیاقت علی خان ان کی طرح بالادست نہیں تھے۔ لیاقت علی خان کے دور میں کوئی آئین نافذ نہ ہو سکا۔ جناح کی وفات کے بعد وہ سیاسی منظر نامے پر آئے۔ پاکستان کے پہلے دس سال محلاتی سازشوں کے سال ثابت ہوئے جن کے دوران سات وزیراعظم بنے۔ چوہدری غلام محمد اقتدار کا مرکز رہے۔ انہوں نے امریکا مخالف سیاسی رہنماؤں کی کامیابی کے خوف سے اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان کے ہاتھوں مارشل لاء نافذ کروایا۔ بیوروکریسی کو بھی مُلکی معاملات اپنے ہاتھوں میں لینے کا موقع ملا۔

نعیم طاہر: اب ہم گفتگو کا سلسلہ وہاں سے آگے بڑھاتے ہیں جب آپ ایوب خان کی سیاسی جماعت کونشن مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔

حنیف رامے: صدر جنرل ایوب خان اپنا ایک سیاسی سفر پشاور تا کراچی بذریعہ ریل گاڑی کرنے والے تھے اور وہیں راجہ حسن اختر وفات پا گئے۔ مرنے سے کُچھ وقت قبل مجھے فون کیا اور کہا کہ "حنیف سیاست کانٹوں کی سیج ہے۔ اس میں دوست ہی آپ کے رقیب ہیں۔ اب باحوصلہ رہنا اور چھوٹی باتوں سے پریشان نہ ہونا"۔

نعیم طاہر: انہوں نے کہا کہ آپ کے دوست ہی آپ کے رقیب ہوتے ہیں۔

اچھا۔

حنیف رامے: اور یہ بات بعد میں میرے مشاہدہ میں بھی آئی، کہ قریب ہے سو رقیب ہے۔ رقیب اور عاشق دونوں ایک ہی محبوب سے محبت کرتے ہیں۔ رقیب کی قربت ہی ہمارے لیے دُکھ اور پریشانی کا سب سے بڑا سبب بنتی ہے۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

حنیف رامے: مجھے نصف شب خبر موصول ہوئی کہ راجہ حسن اختر وفات پا گئے ہیں۔ اب میرے لیے واپسی کا سفر بہت آسان تھا لیکن ان کے فون نے میرا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہاں میری ملاقات سیکشن آفیسر نعیم احمد خان سے ہوئی۔ یہ وزیراعظم کے گھریلو انتظام و انصرام کی بھی نگرانی کرتے تھے۔ کُچھ دیر گفتگو کے بعد وہ یہ اصرار کرنے لگے کہ سر آپ یہاں سے چلے جائیں یہ آپ کی جگہ نہیں ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: 1965ء کی جنگ میں جنرل ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ میں

Scanned with CamScanner

بھٹوصاحب کی حمایت اور جنرل ایوب کے مخالف تھا۔ چنانچہ میں اپنے دوستوں کے ہمراہ ایک نئی سیاسی جماعت کا منصوبہ بنانے لگا۔

نعیم طاہر: اس منصوبے میں کون کون شامل تھا؟

حنیف رامے: سب سے پہلے ہم بھٹوصاحب سے ملے۔

نعیم طاہر: آپ؟

حنیف رامے: جی میں اور میرے ایک عزیز دوست غالب احمد، شاعر بھی ہیں لیکن اب سیاست میں نہیں ہیں۔ ہم دونوں کی اُن سے فلیٹیز ہوٹل (Faletti's Hotel) میں ملاقات ہوئی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: یہ اُس روز کی بات ہے، جس دن بھٹوصاحب تین ماہ کی بالجبر چھٹی گزار کر کابل کے راستے راولپنڈی پہنچے۔ وہاں ہمارے ایک مشترکہ دوست حسن میر صاحب نے بھٹوصاحب سے گزارش کی کہ لاہور میں ہمارے بڑے اہم دوست حنیف رامے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

نعیم طاہر: خورشید حسن میر تو نہیں؟

حنیف رامے: جی ہاں۔ خورشید حسن میر صاحب۔

نعیم طاہر: اچھا۔ خورشید حسن میر صاحب۔

حنیف رامے: تو بھٹوصاحب نے کہا کہ میں فلیٹیز ہوٹل میں قیام پذیر ہوں گا۔ حنیف رامے سے کہو کہ وہ پہلے نُصرت بھٹو سے ملے اپنا تعارف کروائے۔ پھر نُصرت بھٹو ہماری ملاقات کا اہتمام کروائیں گے۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

حنیف رامے: جب میں کوئٹہ میں مقیم تھا۔ شاہین کی ملازمت کے دوران گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف بطور پرنسپل تعینات تھیں۔ وہاں اُنہیں معلوم ہوا کہ رسالہ ''نصرت'' اور ''سویرا'' کے بانی حنیف رامے صاحب، شاہین کے میاں ہے تو وہ ہمارے گھر آئیں۔ اُس دن سے ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کے ساتھ ایک دوستی کا رشتہ استوار ہوگیا۔

وہاں امیر عثمان صاحب بھی دوست بنے جو بعد میں میکسیکو اور افغانستان کے سفیر رہے۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: یہ 1961ء، 1962ء اور 1963ء کی بات ہے۔ ہم تین، چار دوست وہاں بیٹھے پاکستان کے

موجودہ حالات وواقعات اور اس کے مستقبل کے بارے میں سوچ بچار کرتے رہتے تھے۔

نعیم طاہر: یہ آپ دوست اپنے طور پر سوچتے تھے۔ بھٹوصاحب ابھی شامل نہیں ہوئے تھے۔

حنیف رامے: نہیں ابھی نہیں۔ ہم اپنے طور پر ہی غوروفکر کرتے تھے۔ ابھی جنرل ایوب خان کا دور دورہ ہے اور بھٹوصاحب ان کی سیاسی جماعت کنونشن مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: جب مجھ پر قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا کشف ہوا تو میں باردیگر لاہور آگیا۔ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کا تبادلہ گورنمنٹ کالج راولپنڈی ہوگیا۔ وہاں اُن کا رابطہ خورشید حسن میر سے ہوا۔

1965ء میں ہم نے رسالہ ''نصرت'' میں اسلامی اشتراکیت پر لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ہم سب دوستوں کا ایک حلقہ مشمولہ خورشید حسن میر، غالب احمد، صفدر میر، ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف، پروفیسر اشفاق علیم اور ڈاکٹر نجم پر مبنی ''بزم پاکستان'' کے نام سے تشکیل پا گیا۔

نعیم طاہر: بزم پاکستان۔ اچھا۔۔۔

حنیف رامے: ہمارے ایک اور دوست شاہد اختر (اُن دنوں کینیڈا میں مقیم تھے) نے ہمیں باخبر کیا کہ اسی طرح کا ایک سیاسی حلقہ ڈاکٹر مبشر حسن کے ہمراہ بھی بن رہا ہے۔

شاہد اختر کے ہمراہ ایک اور دوست لطیف مرزا بھی تھے۔ وہ سرکاری ملازمت کرتے تھے۔

شاہد اختر اور لطیف مرزا مجھے زورآوری سے ڈاکٹر مبشر حسن کے پاس لے گئے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: ڈاکٹر مبشر حسن کا رجحان فلاحی کاموں کی طرف زیادہ تھا۔ مثال کے طور پر گلیوں کی صفائی، لائبریریاں اور ہسپتال بنانے کے خواہشمند تھے۔ میں نے اُن سے گفتگو کے دوران اُن کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سیاست کے بغیر ملک وقوم کی خدمت نہیں کی جاسکتی۔ روز بروز یہ دونوں حلقے ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: ابھی ہمارے اور ڈاکٹر مبشر حسن کے سیاسی حلقے میں اتحاد نہیں ہوا تھا۔ تو میری بھٹوصاحب سے ملاقات ہوگئی۔ بھٹوصاحب نے مجھے کہا کہ تم اشتراکیۃ الاسلامیہ کے نظریے کی بنیاد پر سیاسی

Scanned with CamScanner

جماعت بنانا چاہتے ہو۔ تو کیا تم نے اس پر کوئی خاکہ تیار کیا ہے؟

نعیم طاہر: یہ بھٹو صاحب نے فلیٹیز ہوٹل میں آپ سے کہا؟

حنیف رامے: جی فلیٹیز ہوٹل میں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: میں اُردو زبان میں لکھا ہوا مسوّدہ بھٹو صاحب کے پاس لے گیا۔ بھٹو صاحب نے کہا! کہ میری سہولت کے لیے انگریزی زبان میں لکھ دو۔ ابھی میں مزید دو دن لاہور میں ہی ہوں۔ میں نے، غالب محمد اور صفدر میر نے اس خاکے کو جس قدر جلدی ہو سکا انگریزی میں ترجمہ کردیا۔

نعیم طاہر: یہ قیاس آرائیوں پر مبنی خاکہ تھا؟

حنیف رامے: جی قیاس آرائی پر مبنی خاکہ:

جب 1967ء میں ڈاکٹر مبشر حسن ہی کے گھر پر ہونے والے ایک تاسیسی کنونشن میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے پارٹی کی بنیاد رکھی تو ان کاغذات کی فائل میں سب سے پہلا کاغذ یہی خاکہ تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: میرے لیے قرآنی احکام کی اتباع بھی لازمی تھا لہٰذا سیاست میں بھی قرآن و سنت کی روشنی میں فیصلے کرنا میرا اوّلین مقصد تھا۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف رامے: تمام انبیاء میں صرف حضرت محمد مصطفٰی نے ریاست کی بنیاد رکھی۔ وہ بحیثیت رہنما سیاسی و سماجی مصلح اعظم تھے۔

مائیکل ہارٹ (Micheal H. Hart) کی کتاب
The 100: A Ranking of the most influential Persons in History کے مطابق انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ بااثر شخصیت نبی کریمؐ ہیں۔ اسلام ایک کامل دین ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کرتا ہے۔

محمد ﷺ نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ریاستِ مدینہ سے کیا۔ وہاں ایک دستوری حکومت قائم کی، اور انتظامیہ قانون الٰہی کے سپُرد اور عدلیہ انتظامی دباؤ سے آزاد تھی۔ نبی پاک نے اپنے عمل سے

معاشرتی، سیاسی ثقافتی زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسانیت کی رہنمائی فرما کر ایسا معاشرہ تشکیل دیا جو سراپا اخلاق و عمل اور امن تھا۔

آپ ﷺ اپنے مسجد نبوی کو کمیونٹی سنٹر اور سیکرٹریٹ کا درجہ دیا اور تمام امور کے فیصلے مشترکہ رائے سے مسجد کے احاطے میں کیے اور ایک اچھے منتظم کی حیثیت سے کتاب وحی، مالیت کا ریکارڈ، مہر نبوی کی حفاظت، محکمہ عدل، احتساب اور جرائم کے سدِ باب کے لیے مختلف شعبے منظم کیے اور دوسرے علاقوں میں والی، عاملہ اور قاضی مقرر کیے۔ آپ ﷺ نے ایک اچھے سفارت کار کی حیثیت سے غیر ملکی حکمرانوں کو جو مدلل اور سادہ خطوط تحریر کیے اس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔

نعیم طاہر: جی بے شک۔۔۔

حنیف رامے: مجھے اپنے اوپر فخر تو نہیں ہے لیکن اللہ شاہد ہے کہ اس رب العزت کی مہربانی سے میں حکومتوں کا حصّہ رہا ہوں۔ لیکن ایک پیسہ تو کیا کبھی ایک سگریٹ کی جانب بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔ میرا خیال ہے کہ نصف لاہور کے علاقوں مثلاً اقبال ٹاؤن، ریواز گارڈن، گلبرگ میں تقریباً چھ لاکھ افراد میں پانچ مرلے کے پلاٹ مُفت تقسیم کیے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بھٹو صاحب کا بڑا ووٹ بینک ہے۔ اگر یہ منصوبہ بھٹو صاحب کا ہوتا تو پنجاب کے دیگر صوبوں سندھ، سرحد، اور بلوچستان میں بھی نافذ العمل ہوتا۔

جبکہ پنجاب میں اس منصوبہ سازی کا بیڑا اٹھانے والے لڑکے کی شخصیت کی تعمیر و ارتقاء میں اُس کی غربت کا اہم کردار تھا اور اس کی زندگی قربانیوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان بن گئی تھی۔ اس لڑکے نے یہ احساس کیا کہ صدیوں سے زمینوں پر کام کرنے والے مزارعین اور پہاڑ کی چوٹی کاٹ کر نہر نکالنے والوں کے لیے جب ملکیت کا سوال آتا ہے تو کھیت کے مالک کے طور پر ان کا نام شاذ و نادر ہی لِکھا جاتا ہے۔ دیہی مرد و خواتین مزارعین کی بڑی تعداد کا شمار غُرباء میں سب سے زیادہ غریب کے طور پر ہوتا ہے۔ بڑے زمیندار اور جاگیردار بھی ان کی استحصال کرتے ہیں کبھی مزارعین کے بیٹوں کے بیگار کی صورت میں اور کبھی اُن کے بیٹوں کی عزت کے نام پر۔

میں نے تقریباً چھ لاکھ گھرانوں میں مفت پلاٹ تقسیم کیے لیکن ایک اِنچ زمین کا حصہ اپنے خاندان کے کسی بھی فرد کو وارث نہیں بنایا۔

اب ایسے ناتجربہ کار اور کم علم لوگ سیاست میں حصہ لے رہے ہیں جو اسلام اور اس سے وابستہ تمام

Scanned with CamScanner

علوم اور شعبہ ہائے زندگی کا گیان نہیں رکھتے۔ محض سرمایہ پرست لوگ سیاست کو اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔

نعیم طاہر: جی۔۔

حنیف رامے: تاریخ کے بارے میں ہماری ایک کج فہمی ہے کہ شاید تاریخ کو بڑی بڑی شخصیات کے کارہائے نمایاں کی اینٹ اینٹ سے تعمیر شدہ تاج محل سمجھا جاتا ہے۔

لیوٹالسٹائی (Leo Tolstoy) نے اپنے تاریخ ساز ناول امن اور جنگ (War and Peace) جو تاریخ اور فلسفہ کی آمیزش سے بُنا گیا ہے۔ لیوٹالسٹائی اپنے اس ناول میں نپولین (Nepoleon) کی عسکری مہارت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''تاریخ میں واقعات کا ایک سمندر دکھائی دے گا لیکن یہ تاریخی واقعات تمام انسانوں کی سوچ اور رویوں سے جنم لیتی ہے''۔

ہم نے بھی اجتماعی زندگیوں کا طور طریق اور لائحہ عمل نہیں بنایا ہے۔

نعیم طاہر: ہماری نوجوان نسل کو جو تاریخ پڑھائی جا رہی ہے وہ برسرِ اقتدار حکمرانوں اور فرمانرواؤں کے دلچسپ قصوں پر مبنی ہے۔ وہ بادشاہوں کے جذبوں کی رنگلی مٹی میں گوندھی ہوئی کہانیاں ہوتی ہیں۔

اور جیسا کہ آپ نے کہا کہ تاریخ تو انسانوں کی مجموعی سوچ سے نمو پذیر ہوتی ہے۔

حنیف رامے: نعیم آپ نے بہت خوبصورت بات کہی۔

ہمارے مُلک میں جب جمہوری قائدین برسرِ اقتدار آتے ہیں تو وہ تاریخ میں انہیں بادشاہوں کی داستانیں پڑھ کر بادشاہ بن جاتے ہیں اور عوام بھی ان کو بادشاہ سلامت تسلیم کر لیتی ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔ اب میں پاکستان کے دردرسیدہ جزو داستان کی جانب بڑھ رہا ہوں۔

دسمبر 1967ء پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ 1970ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور دسمبر 1971ء میں جنرل یحییٰ خان نے پاکستان کی عنانِ حکومت ذوالفقار علی بھٹو کو سونپ دی۔

اب یہاں غم ناک بات سانحہ مشرقی پاکستان کی ہے جو سیاسی اور فوجی قیادت کی ناکامیوں کی طویل کتھا تھی۔

آپ کا خیال میں اس المناک واقعہ کا جب پاکستان دولخت ہو گیا تھا کیا اسباب و وجوہات ہیں؟

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا اصل ذمہ دار کون تھا؟

حنیف رامے: اس حمام میں بہت سے لوگ ننگے ہیں۔ دونوں حصوں کی عوام میں غلط فہمیاں بڑھنے لگیں۔ ایک وقت تھا کہ یہاں کے لوگوں کی زبان پر یہ بات زدِ عام تھی کہ ''یہ جو بنگالی جاتے ہیں تو جائیں۔ بوجھ اُتر جائے گا''

اس سانحے کے بعد انہیں لوگوں کو میں نے اشکبار دیکھا۔ عدم اعتماد کی اس فضا میں دونوں حصّوں کی عوام ایک دوسرے سے بہت دُور ہو گئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ عوام کو حقیقت سے ہی آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: 1966ء میں صدر ایوب خان کے خلاف مُلک کے دونوں حصّوں سے تعلق رکھنے والی حزبِ اختلاف کی سیاسی جماعتوں کا ایک اجلاس مین بلیوارڈ گلبرگ میں چودھری محمد علی کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حسین شہید سہروردی کی قائم کردہ سیاسی جماعت ''عوامی لیگ'' کے سربراہ شیخ مجیب الرحمن نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس کے داعی (Convener) نواب زادہ نصر اللہ خان تھے۔ اس اجلاس میں پہلی بار یہ مشہور چھ نکات پیش کیے گئے تھے۔

نعیم طاہر: 1952ء میں جب حسین سہروردی نے عوامی لیگ قائم کی تو شیخ مجیب الرحمن نے اس وقت بھی عوامی لیگ کی تشکیل میں حصّہ لیا۔ 1953ء میں وہ عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری بھی بن گئے تھے۔

مارچ 1954ء کے انتخابات میں وہ جگتو فرنٹ کے امیدوار کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ دنیا بھر میں عالمی امن کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ فروری 1966ء میں انہوں نے پہلی مرتبہ لاہور میں منعقد اجلاس میں چھ نکات پیش ہوئے۔

حنیف رامے: چودھری محمد علی کے گھر منعقد اجلاس میں شریک اہم رہنما بھی ایک دوسرے کو سقوطِ ڈھاکہ کا ذمہ دار ٹھہراتے رہے۔ جبکہ ان سیاستدانوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی اور کوتاہ نظری کے باعث شیخ مجیب الرحمن کے ان چھ نکات کو نگاہِ غور کے قابل ہی نہ سمجھا۔ کبھی ان چھ نکات کو ایوب خان کے سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر کے ذہن کی پیداوار سمجھا گیا۔ کبھی شیخ مجیب الرحمن کو واجبی سا لیڈر قرار دیتے تھے اور کبھی شیخ مجیب الرحمن کی اس سنجیدہ کوشش کو ہندوستان کی سازش کہتے۔

جبکہ وہ دستاویز قابلِ غور تھے۔

نعیم طاہر: جی بالکل قابلِ غور تھے۔

حنیف رامے: کسی بھی کام میں کامیابی اور ناکامی کا انحصار بروقت فیصلوں پر منحصر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کبھی ہمارے سر درد کا تدراک دو گولی اسپرین (ASPIRIN) سے ہے۔ لیکن جب کبھی یہ درد بڑھ کر مَرض کی شکل اختیار کر لے تو پھر مریض کا باقاعدہ ہسپتال میں اس کے جانبر ہو جانے تک علاج معالجہ کیا جاتا ہے؟

ایسا ہی معاملہ سانحہ سقوط ڈھاکہ میں پیش آیا۔ یہ حادثہ یک بیک نہیں ہوا، اس میں بھی وقت کی برسوں کی پرورش شامل ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: شیخ مجیب الرحمن کے پیش کیے گئے چھ نکات نظر انداز کرنے سے معاملات ہاتھ سے نکل گئے اس صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندو انتہا پسند عناصر بھی سرگرم عمل ہو گئے۔ انہوں نے بنگلہ دیش میں موجود بنگالی ہندوؤں کو تیزی سے متحرک کر کے بنگلہ زبان اور چند سیاسی معاملات پر بنگالی اکثریت کو پاکستان سے متنفر کرنے میں کوشاں رہے۔

نعیم طاہر: لیکن اس سازش میں شیخ مجیب الرحمن تو شریک نہیں تھا؟

حنیف رامے: مجیب۔۔۔۔

نعیم طاہر: جی۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان، جسٹس محمود الرحمن کی مروجہ کمیشن رپورٹ کے مطابق شیخ مجیب الرحمن اس سازش کا حصّہ نہیں تھا۔ لیکن چند اعلیٰ افسران اپنے مشترکہ سیاسی مفاد کی خاطر صدر ایوب خان کو غلط مشورے دے رہے تھے کہ شیخ مجیب الرحمن سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کو اس سازش میں ملوث کر دیں۔

حنیف رامے: لیکن اس نے بھی اس کو اپنے سیاسی مقاصد کی بھینٹ چڑھایا۔

نعیم طاہر: جی بالکل ایسا ہی کیا۔

حنیف رامے: عدالت میں پیشی کے وقت جب شیخ مجیب الرحمن سے اُن کا نام پوچھا جاتا تو وہ جواب دیتے، بنگلہ دیش۔۔۔۔۔۔۔۔

نعیم طاہر: بنگلہ بندو۔

حنیف رامے: بنگلہ بندو۔۔۔۔ آپ کی یاد دہانی کے لیے بتاؤں کہ یحییٰ خان نے 20 مارچ 1970 کو لیگل فریم

ورک آرڈر (Legal Framework Order) جاری کیا۔ جس میں مستقبل کے دستور کے بنیادی اصول طے کیے گئے تھے۔ یحییٰ خان نے ون یونٹ (One Unit) توڑ کر مغربی پاکستان کے چاروں صُوبے بحال کر دیے۔ One Man One Vote کا اصول نافذ کر کے مشرقی پاکستان کو قومی اسمبلی میں 162 سیٹیں جبکہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو 138 نشستیں دے دیں۔

نعیم طاہر: ایک تاریخی غلطی کی۔

حنیف رامے: جی ہاں ناقابلِ فراموش لغزش۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف رامے: میں بھی اس پریس کانفرنس میں شریک تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: رسالہ ''نصرت'' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھے بھی دعوت نامہ موصول ہوا۔

میں نے اس پریس کانفرنس میں یحییٰ خان سے اس مسئلے پر استفسار کیا کہ ''جناب صدر! آپ کی گفتگو سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آپ شیخ مجیب الرحمن کو ان چھ نکات کی بنیاد پر انتخابات میں شرکت کی اجازت دے رہے ہیں۔''

اس نے کہا! ''جی ہاں''۔

میں نے کہا اگر شیخ مجیب الرحمن نے عام انتخابات میں ان چھ نکات کی بنیاد پر کامیابی حاصل کر لی تو پھر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان متحد نہیں رہ سکیں گے۔

نعیم طاہر: یہ آپ نے کہا؟

حنیف رامے: جی میں نے کہا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: جنرل یحییٰ خان نے اپنے معاونِ خصوصی میجر جنرل اسحاق محمد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نعیم طاہر: جنرل یحییٰ خان کے مشیر خاص میجر جنرل اسحاق محمد اور پرنسپل سٹاف آفیسر جنرل پیرزادہ تھے۔

حنیف رامے: جنرل یحییٰ خان نے اُن سے پوچھا کہ یہ صاحب کون ہیں؟ میجر صاحب نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کے رہنُما ہیں۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: جنرل یحییٰ خان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

Young man you fight election and we will meet in the National Assembly and we will talk about that.

میں نے جواب دیا! کہ جناب صدر آپ کا لیگل فریم ورک آرڈر شاید یہ موقع فراہم نہ کرے کہ میری آپ کے ساتھ اسمبلی میں ملاقات ہو سکے۔

نعیم طاہر: آپ نے یہ بات بھی کہہ دی؟

حنیف رامے: جی یہ بھی کہہ دی۔

اب دوسرا معاملہ آئینِ پاکستان کے نفاذ کا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: ملک میں پارلیمانی یا صدارتی نظام اقتدار کے نفاذ کا فیصلہ ابھی متعین ہونا تھا۔

میں نے اس ضمن میں "نصرت" میں بہت سے مضامین اور ایک اداریہ لکھا۔ میں نے بھٹو صاحب کو ایک طویل خط بھی لکھا جس میں یہ تجویز پیش کی کہ پارلیمانی نظام حکومت کی عمدہ مثال ملک برطانیہ ہے اور صدارتی نظام اقتدار کی نظیر امریکا ہے۔ نیم صدارتی جمہوریہ کا عُمدہ نمونہ فرانس ہے۔

نعیم طاہر: نیم صدارتی جمہوریہ نظام؟

حنیف رامے: اس نظام حکومت میں صدر اور وزیر اعظم دونوں بااختیار ہوتے ہیں۔ صدر کا انتخاب امریکی سیاسی نظام کے طرز پر اور وزیر اعظم کا انتخاب برطانوی سیاسی نظام کے طرز پر ہوتا ہے۔

اس طرح صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں ایک توازن قائم رہتا ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل ٹھیک۔

حنیف رامے: پاکستان کے بھی دو حصّے ہیں۔ اگر ہم مشرقی و مغربی پاکستان میں کچھ اس انداز کا نظام حکومت لائیں کہ صدر اور وزیر اعظم دونوں بااختیار ہوں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر مشرقی پاکستان کی سیاسی جماعتیں ایوان بالا میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوں گی تو وزیر اعظم مشرقی پاکستان کا اور صدر مغربی پاکستان سے اور یہی بات طرف برعکس بھی لاگو ہوگی۔ اس طریق کار سے دونوں حصّوں

کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو شریکِ اقتدار ہوں گے۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

حنیف رامے: اب یہاں یحییٰ خان نے اپنے سیاسی مفاد کی خاطر اس معاملے میں کشیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

وہ بھٹو صاحب سے کہتا تھا کہ کوئی ایسی تجویز اختیار کرو کہ مجیب الرحمٰن سیاست سے برطرف ہوجائے اور مجیب الرحمٰن سے کہتا تھا کہ کوئی ایسی ترکیب اختیار کرو کہ بھٹو اقتدار کے کھیل سے برخواست ہوجائے۔ کیونکہ یحییٰ خان خود ہی برسرِ اقتدار رہنا چاہتا تھا۔

جبکہ صدر یحییٰ خان نے لیگل فریم ورک کا آرڈر نافذ کرکے یہ اعلان کیا تھا کہ ملک کی آئندہ اسمبلی 120 دن کے اندر اندر نیا آئین تیار کرے گی۔ اقتدار نئی جمہوری حکومت کو منتقل کر دیا جائے گا۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

حنیف رامے: ملک کا انتقال ہوگیا لیکن اقتدار کا انتقال نہ ہوسکا۔

نعیم طاہر: شیخ مجیب الرحمٰن کی دھان منڈی میں واقع رہائش گاہ پر پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے سربراہان کے درمیان ہونے والے مذاکرات ناکام ہوگئے؟

حنیف رامے: جی ہاں۔ کیونکہ دونوں سربراہان اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔

25 مارچ کو بھٹو صاحب دوبارہ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کے لیے ڈھاکہ گئے۔ اس ملاقات میں شیخ مجیب الرحمٰن نے بھٹو صاحب سے کہا! کہ بھٹو اب وقت گزر گیا ہے اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اب میں اپنی عوام کے جذبات کا اسیر ہوں۔

نعیم طاہر: وسط فروری میں جب یہ اعلان ہوا کہ قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس 3 مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں ہوگا۔ لیکن بھٹو صاحب نے یہ اجلاس غیر معینہ مُدت کے لیے ملتوی کر دیا۔

اگر بھٹو صاحب یہ اجلاس ملتوی نہ کرتے تو دونوں حصّوں کے سیاسی معاملات میں شاید مصلحت کے امکانات تھے۔ اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شیخ مجیب الرحمٰن نے ابھی صرف آئین کا ایک خاکہ ساہی بنا کر پیش کیا تھا۔

یہ دونوں حصوں کے درمیان مفاہمت کے حوالے سے آخری تاریخی موقع تھا کہ شاید پاکستان کی دوسری آنکھ اس سے جُدا نہ ہوتی۔

Scanned with CamScanner

حنیف رامے: دیکھیے بھٹو صاحب پر یہ الزام بھی عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے 28 فروری 1971ء کو مینار پاکستان کے سائے تلے شعلہ بار تقریر کی، اور قومی اسمبلی کے اجلاس ڈھاکہ کا بائیکاٹ کرتے ہوئے کہا کہ "ہم ڈھاکہ نہیں جائیں گے بلکہ جو جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے"۔

نعیم طاہر: جی اکثر یہ بات کہی جاتی ہے۔

حنیف رامے: اس واقعہ سے میری ذات بھی وابستہ ہے کیونکہ اس تقریر کا نہ صرف راقم ہوں بلکہ بھٹو صاحب کی خواہش پر اس تحریر کو بہ سماعت بھی لایا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: بھٹو صاحب بادشاہی مسجد کے میناروں کو گواہ بنا کر میری لکھی ہوئی تقریر ہی پڑھتے ہیں۔ اس اضافی بیان کا کہ "میں یحییٰ خان سے کہتا ہوں کہ قومی اسمبلی کا اجلاس طلب نہ کیا جائے ہم ڈھاکہ نہیں جائیں گے بلکہ جو ڈھاکہ جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔" میری تحریر سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس ضمنی بیان سے ہر شخص لاعلم تھا۔

نعیم طاہر: رامے صاحب آپ نے تو بہت بڑا راز افشاء کیا، یہ بات شاید اب تک ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھی۔

حنیف رامے: جی ہاں۔

نعیم طاہر: اس آتشیں تقریر میں بھٹو صاحب نے "اُدھر تم، اِدھر ہم" کا بیان دیا تھا؟

حنیف رامے: نہیں، وہ کراچی کے ایک جلسہ میں کہا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا وہ تقریر کراچی کے جلسہ میں کی۔

حنیف رامے: اس اضافی بیان سے تو یہ واضح ہے کہ صدر یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے درمیان غیر رسمی ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: یہ امر یقینی ہے کہ بھٹو صاحب خواہاں تھے کہ صدر یحییٰ خان ابھی قومی اسمبلی کا اجلاس طلب نہ کریں اور اس میں وہ حق بجانب تھے۔

نعیم طاہر: حق بجانب تھے؟

حنیف رامے: بھٹو صاحب کو معلوم تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کر کے ایوان میں

سب سے بڑی سیاسی جماعت بن کے ابھرے گا۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: شیخ مجیب الرحمٰن دوسری اتحادی جماعتوں سے مفاہمت کر کے بآسانی مخلوط حکومت بنا سکتے تھے۔ اگر وہ بھٹو صاحب کو نظر انداز بھی کرتا تب بھی پیپلز پارٹی پنجاب اور سندھ میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کرنے کی بناء پر اقتدار میں شمولیت اختیار کر لیتی۔

نعیم طاہر: لیکن وہ بھٹو صاحب کو نائب وزیر اعظم کا عہدہ دینے پر بھی رضامند تھا۔

حنیف رامے: یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: بھٹو صاحب اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اگر اسمبلی سے باہر سیاسی جماعتوں میں معاہدہ نہ ہوا تو ایوان بالا میں ان چھ نکات کی بنیاد پر دستور نافذ ہو جائے گا۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: اب میری بات غور سے سنیں۔ میں آپ کو گواہ بنا کر اپنے اہل وطن کو گوش گزار ہوں کہ اگر ایک بار یہ چھ نکات آئین کا حصہ بن جائے تو پھر ادھر بھی چار پاکستان اور بنے۔
اس غرض سے بھٹو صاحب نے قومی اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا۔ تاکہ آپس میں مستقبل کے آئین اور سیاسی ڈھانچے پر سمجھوتہ ہو جائے۔
شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو صاحب کی ملاقاتیں نتیجہ خیز نہ ہوئیں کیونکہ صدر یحییٰ خان اپنے ذاتی سیاسی مفاد کی خاطر ان دونوں کے درمیان مفاہمت نہیں چاہتے تھے۔

نعیم طاہر: شیخ مجیب الرحمٰن انتخابی میدان میں اپنے چھ نکات سے لیس ہو کر اترا اور بنگالیوں کے استحصال اور محرومیوں کو آگ لگا کر عوام کو جذبات کے سمندر میں بہا کر لے گیا۔

حنیف رامے: اب ایک اور واقعہ کا بھی بھٹو صاحب پر الزام آتا ہے۔ جب شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو صاحب کے درمیان ڈھاکہ میں ہونے والے مذاکرات کامیاب نہ ہو سکے تو یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع کی۔

نعیم طاہر: فوجی کارروائی تھی؟

حنیف رامے: اس سے پہلے پولیس کارروائی تھی۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف رامے: اس بات کا بھی پسِ منظر ہے۔ یہ معاملہ ہماری سیاسی جماعت میں بھی زیرِ بحث تھا کہ کیا صدر یحییٰ خان مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی اجازت دیں گے؟ میں نے بھٹو صاحب کے سامنے اپنا یہ مؤقف پیش کیا اگر آپ اور مجیب الرحمٰن کے درمیان سمجھوتہ نہ ہوا تو صدر یحییٰ خان فوجی کارروائی کی اجازت دیں گے۔ بھٹو صاحب میرے اس مؤقف کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ اُن کے اندازِ بیاں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی اس کارروائی کے حق میں ہیں۔

نعیم طاہر: کہ فوجی کارروائی ہو؟

حنیف رامے: کہ فوجی کارروائی کرے گا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: شام بھر یہ موضوع زیرِ بحث رہا۔ اگلی صُبح، ہم ان کے گھر کے برآمدے میں بیٹھے تھے کہ سیڑھیاں اُترتے ہی مجھ سے مُخاطب ہو کر کہا کہ "حنیف کیا اب تمہاری وہی رائے ہے؟ میں نے کہا کہ فوجی کارروائی کے حوالے سے اب بھی میرا نقطہ نظر حتمی ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: پھر بھٹو صاحب ہم سے استفسار کرتے ہیں کہ صدر یحییٰ خان ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا مجھے جانا چاہیے؟ ہم نے کہا آپ ضرور جائیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔

نعیم طاہر: فوجی کارروائی کے حوالے سے آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

حنیف رامے: میں اس تاریخی واقعہ کا چشم دید گواہ ہوں کہ بھٹو صاحب تاریخ کے طالب علم ہونے کے باعث اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ پاکستان کو دولخت کرنے والوں کی فہرست میں اُن کا نام شامل ہو۔ چنانچہ جلال الدین عبدالرحیم اور جنرل پیرزادہ کے درمیان ایک خاص مُلاقات کا اہتمام کیا گیا جس میں ایک خاص دستاویز پر گفت وشنید ہوئی۔

میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہ دستاویز میں نے بھی پڑھی کیونکہ یہ سینٹرل کمیٹی کے اراکین کو بھی بھیجا گیا لیکن بعد میں واپس لے لیا گیا۔ یہ دستاویز اس اساس پر ارقام ہوا کہ اگر ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس کے دارالحکومت دہلی یا آگرہ دونوں ہی ہمیشہ تغیر وتبدل کا شکار رہے۔ بنگال میں بھی پہلی بار علم بغاوت بُلند نہیں ہوا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف رامے: چنانچہ جب بنگال میں صدر یحییٰ خان نے فوجی کارروائی کا آغاز کروایا تو بھٹو صاحب نے Intercontinental Hotel سے ڈاکٹر مبشر حسن سے کہا کہ لاہور میں حنیف کو فون کر کے بتاؤ کہ تمہاری پیشن گوئی بالکل ٹھیک ثابت ہوئی اور فوجی کارروائی کا آغاز ہو چکا ہے۔ اور مبشر حسن نے مجھے یہ بھی کہا کہ حنیف فوجی اور پولیس کارروائی کا فرق تمہاری قیاس آرائی سے بھی بالا ہے۔

جب بھٹو صاحب پاکستان واپس تشریف لائے تو ان کے منہ سے یہ واحد جُملہ جاری ہوا کی Pakistan Is Saved پاکستان بچالیا گیا ہے۔

نعیم طاہر: کراچی ائیر پورٹ پر۔

حنیف رامے: گویا کہ یحییٰ خان کے حُکم پر ہونے والی بنگال میں فوجی کارروائی میں بھٹو صاحب بھی غائبانہ طور پر موجود تھے۔ لیکن بھٹو صاحب کا یہ جُملہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ انہوں نے پاکستان ک بچانے کی قیمت صدر یحییٰ خان کو فوجی کارروائی میں بھرپور تعاون کی صورت میں ادا کی۔

نعیم طاہر: درست۔

حنیف رامے: لوگ پاکستان کو دولخت کرنے میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سقوط کا ذمہ دار اُس وقت کا حکمران صدر یحییٰ خان ہے۔ اس نے اپنے سیاسی مفاد کی خاطر ان دو بڑی جماعتوں میں سمجھوتہ نہ ہونے دیا۔ جبکہ ان دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو مُلک کی دیگر سیاسی جماعتوں کی پُر زور حمایت حاصل تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو مغربی پاکستان اور شیخ مجیب الرحمٰن کو مشرقی پاکستان سے واضح اکثریت ملی تھی۔

اگر ان دونوں رہنماؤں کو فرانسیسی دستور کے مطابق اقتدار سونپ دیا جاتا تو پاکستان کو دولخت ہونے سے بچایا جاسکتا تھا۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

حنیف رامے: قصہ کوتاہ جب بھٹو صاحب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور عبوری صدر کے عہدے پر فائز ہوئے تو یحییٰ خان نے امریکا کے صدر Richard Nixon سے فرمائش کی کہ بھٹو صاحب سے گزارش کریں کہ میرے ساتھ نازیبا سلوک نہ کریں باوجود اس کے کہ یحییٰ خان نے اپنی سیاسی بصیرت کے فقدان کے سبب پاکستان کے دوٹکڑے کر دیے تھے۔

یحییٰ خان کو طویل عرصے تک نظر بند کرنے کے بعد جولائی 1977ء میں ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد خرابیٔ صحت کی بنا پر انہیں رہا کر دیا گیا۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

حنیف رامے: دلچسپ بات یہ ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک جمہوریت کی عالمی طاقت امریکہ کے صدور کی حمایت ہمیشہ ہمارے مُلک کے سربراہان کو حاصل رہی ہے۔

جب 4 جولائی 1999ء کو نواز شریف صاحب اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ ایک نجی دورے پر امریکہ روانہ ہوئے تو واشنگٹن میں صدر بل کلنٹن (Bill Clinton) کے ساتھ مُلاقات میں اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کے یقینی تحفظ کی گزارش کی، تاکہ پرویز مشرف کے ہاتھوں اُن کو کسی قسم کا جانی و مالی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

چنانچہ صدر بل کلنٹن کی سفارش پر نواز شریف کو سعودی عرب کے شہر جدّہ میں سیاسی پناہ مل گئی، جیسے شہنشاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کو مصر کے صدر انور سادات نے سیاسی پناہ دی۔

پاکستان نے ہمیشہ امریکہ کے لیے اپنی خدمات پیش کیں لیکن امریکہ ہمارے لیے کبھی حمایت گر ثابت نہیں ہوا۔

پاکستان نے امریکہ کا ساتھ افغانستان میں ہی بڑی جانے والی رُوس کے خلاف جنگ میں ساتھ دیا اور اس جنگ کی ساری منصوبہ بندی پاکستانی فوجی نے کی۔ امریکہ نے اس کے بدلے میں پاکستان پر معاشی پابندیاں عائد کی۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

حنیف رامے: آج امریکہ کے عالمی طاقت (Super Power) بننے کا سبب رُوس اب عالمی طاقت کی فہرست میں شامل نہیں رہا ہے۔

نعیم طاہر: روس۔

حنیف رامے: رُوس کو شکست دینے میں پاکستان اور افغانستان نے امریکہ کی بہت حمایت کی۔ ان خدمات کے صلے میں امریکہ نے پاکستان کا قرضہ معاف تک نہیں کیا۔ ہمیں چاہیے کہ پاکستان کی علاقائی اور بین القوامی معاشی استحکام اور فروغ کے لیے امریکہ کے ساتھ سُود کاری کریں سستے نہیں بکنا چاہیے۔

نعیم طاہر: بالکل درست ۔۔۔۔ رامے صاحب ابھی آپ نے مجھے اور ناظرین کو گواہ بنا کر ایک بیان دیا کہ اگر شیخ مجیب الرحمن اپنے چھ نکات کی بنیاد پر وزیر اعظم بن جاتا تو آج پاکستان کی صورت حال مُختلف ہوتی۔ آپ کی بات کا مطلب ہے کہ صوبوں میں سیاسی اتحاد زیادہ دیر پا ہوتا۔

صوبوں میں سیاسی اتحاد کا معاملہ فی الوقت رفع دفع تو ہو گیا ہے لیکن بالکل ختم نہیں ہوا ہے۔ اب اس سلسلے میں لوگ 22 مارچ 1940ء کو برِ صغیر کی سرزمین پر پیش کی جانے والی قرارداد لاہور کا حوالہ دیتے ہیں جس میں واضح طور پر کہا گیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے یکجا کر کے ان میں آزاد مملکتیں قائم کی جائیں جن میں شامل یونٹوں کو خودمختاری اور حاکمیت اعلیٰ حاصل ہو۔

اب اس دستاویز کی قانونی حیثیت ہے یا نہیں یہ ایک الگ سوال ہے؟ صوبوں میں بھی بڑھتا چلا گیا۔ آج کل انتخابات میں بھی سیاسی جماعتوں کا یہ منشور ہے کہ امور خزانہ، امور دفاع اور امور خارجہ کی ذمہ داری وفاق کو سونپ دی جائے اور باقی تمام محکمے صوبوں کے حوالے کر دیے جائیں۔

یہ امر شاید مکمل طور پر سیاسی اتحاد کی صورت نہ اپنائے لیکن صوبے اپنے حق خودمختاری کا آج بھی تقاضا کرتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔

حنیف رامے: نعیم صاحب میں نے نہ صرف اس موضوع پر بات کی ہے بلکہ ایک کتاب "پنجاب کا مقدمہ" کے نام سے لکھی ہے۔

نعیم طاہر: میں اس کتاب پر ہی بات کرنا چاہتا ہوں (مزاحیہ انداز میں۔ ہاہاہاہا۔۔)۔

حنیف رامے: بات یہ ہے پروفیسر محمد عثمان نے اس کتاب کا فلیپ لکھتے ہوئے کہا کہ یہ پنجاب ہی کا نہیں پورے پاکستان کا مقدمہ ہے کیونکہ میں نے اس میں بنیادی طور پر صوبائی خودمختاری کا مقدمہ لڑا ہے۔ میں پنجاب کا وزیر اعلیٰ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ پنجاب کے پاس کتنی خودمختاری تھی۔ یہ ہمارے سرحدی، سندھی اور بلوچی بھائیوں کی سراسر خام خیالی ہے کہ صوبہ پنجاب بہت اختیارات کا مالک ہے۔ جبکہ دستور کے مطابق تمام صوبوں کو یکساں مقررہ اختیارات و اقتدار کی خودمختاری حاصل ہے۔

اکثر و بیشتر یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ صوبہ پنجاب کا سرکاری افسر یا تھانے دار عوام کو بے

آبرو کرنے میں زیادہ سہولت محسوس کرتا ہے اس کے برعکس صوبہ سرحد میں تو عوام کے ساتھ محتاط رویہ برتا جاتا ہے۔ دیکھئے بات یہ ہے کہ لوگوں کو وقت پر حقوق نہ دینے سے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف رامے: آئینِ پاکستان 1973ء نے قانون سازی کے اختیارات کو مرکز اور صوبوں کے مابین تین قانون ساز فہرستوں کی وضاحت کر کے تقسیم کیا گیا تھا۔ حصّہ اوّل میں وفاقی قانون سازی کی فہرست Fedral Legislative List میں 59 مضامین اور حصہ دوم میں صوبائی قانون سازی کی فہرست Provisional Legislative List میں 8 مضامین اور حصہ سوئم میں متفقہ قانون ساز فہرست (Concurrent Legislative List) میں 47 مضامین تھے۔

متفقہ قانون ساز فہرست میں مرکز اور صوبے دونوں ہی قانون سازی کے حق دار تھے یہ بھی آئین میں طے کیا گیا تھا کہ اگر اس فہرست میں کسی مضمون کے حوالے سے مرکز اور کسی صوبے کے بنائے ہوئے قوانین کے مابین تنازعہ کی صورت میں وفاق کا بنایا ہوا قانون غالب ہوگا۔ بھٹو صاحب نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ دس برس بعد متفقہ قانون ساز فہرست پر نظرثانی کریں گے اور اس فہرست کے اختیارات صوبوں اور وفاق میں تقسیم کر دیں گے۔ آئین میں دو فہرستیں رہ جائیں گی۔

پُرتاسف امر یہ ہے کہ جب وہ دس برس کا وقت آیا تو جنرل ضیاء الحق صاحب یہاں کے حکمران تھے۔ انہوں نے 4 جولائی 1977 کی شام ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ انہوں نے آئین معطل تو نہیں کیا اور یہ اعلان کیا کہ آپریشن فیئر پلے (Operation Fair Play) کا مقصد صرف ملک میں نوے دن کے اندر انتخابات کروانا ہے۔

نوے دن میں انتخابات کرانے کی بجائے جنرل ضیاء الحق نے خود کو ایک ریفرنڈم میں صدر منتخب کرلیا۔

بھٹو صاحب نے متفقہ قانون ساز فہرست میں ترمیم کا جو وعدہ کیا تھا وہ ساعت سعید ہی نہ آیا۔ اس دوران صوبوں کا احساس محرومی بڑھ گیا۔ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کے بعد تو صوبہ سندھ مزید احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں بلا رد و کد ان دو اہم امور پر عمل درآمد کرنا چاہیے۔ ایک تو، 1973 کے

دستور میں جو متفقہ قانون ساز فہرست Concurrent Legislative List ہے اس کو فوری طور پر "مشترکہ مفادات ہیئت" Council of comon interest میں پیش کر کے مرکز اور صوبوں کو اپنے اپنے اختیارات میں حق خود مختاری دیا جائے۔

دوسرا اہم اَمر یہ کہ پنجاب کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ صوبہ پنجاب آبادی کے تناسب سے بڑا صوبہ ہے۔ پارلیمانی نظام ہو یا صدارتی نظام اکثریت کی بنا پر کسی کو بھی حکمران بنا سکتا ہے۔

"پنجاب کا مقدمہ" کے مصنف حنیف رامے نے پنجاب کو تقسیم کرنے کا مؤقف سب سے پہلے عاصمہ جہانگیر کے اجتماع میں پیش کیا تھا۔ جہاں سندھی، سرحدی اور بلوچی بھائی بھی مدعو تھے۔

اب بہت سے دانش ور پنجاب کی تین حصّوں میں تقسیم چاہتے ہیں۔ تاکہ پنجاب کی بھی دیگر صوبوں کی طرح قومی اسمبلی اور سینیٹ میں یکساں نشستیں ہوں۔ وگرنہ ہر بار پنجاب کو زیادہ وسائل ملنے پر موردِ الزام ٹھہرایا جائے گا۔

بھئی پنجاب میں اگر ساٹھ فیصد لوگ ہیں تو اُن کو خوراک بھی اسی تناسب سے دی جائے گی۔ جس صوبے میں دس فیصد آبادی ہے وہاں اسی تناسب سے خوراک اور پانی تقسیم ہوگا۔

تینوں صوبے مل کر بھی پنجاب کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے اس لیے یہ بہت بہتر ہوگا کہ کوئی پنجابی وزیراعظم آ جائے اور پنجاب تین حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ صوبوں میں سیاسی اتحاد بھی حتمی ہے۔

جنوبی ایشیائی اقوام نے ایک تنظیم "آسیان" Association of Southeast Asian Nations) کے نام سے تشکیل دی ہے۔ یورپ کے تمام ممالک میں اتحاد ہے۔ امریکہ کے اتحادی ممالک کینیڈا سے لے کر چلی تک پھیل رہے ہیں۔

جنوبی ایشیائی علاقوں نے بھی اپنی ایک تنظیم "سارک" South Asia Association For Regional Cooperation) کے نام سے بنائی۔ ہندوستان اور پاکستان کو فی الفور کشمیر کے مسئلے کے حل پر مذاکرات کے ذریعے سمجھوتہ کرنا چاہیے کیونکہ جنوبی ایشیا کی ترقی میں سارک کا کردار مؤثر نہ ہونے کی بڑی وجہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جاری سیاسی اور عسکری کشیدگی کو سمجھا جاتا ہے۔ انہیں کشیدگیوں کے باعث جنوبی ایشیائی ممالک مشترکہ معیشت کا فائدہ اُٹھانے سے قاصر ہیں اپنے قیام سے آج تک یہ تنظیم نشستند، گفتند، برخاستند کی مثال بنی ہوئی ہے۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: ملک کی بقاء کے لیے کسی دستور کا بے باکی اور جرأت سے سامنا کرنا دلیر اور بے باک لوگوں کا کام ہے۔

آپ صوبہ پنجاب کی تقسیم کو ایثار کے معنوں میں کیوں استعمال کرتے ہیں؟ حنیف رامے:

اس لیے کہ یہ عمل سارے ملک کے لیے سودمند ہوگا۔

نعیم طاہر: جی سارے صوبوں کے لیے کارگر ہے۔

حنیف رامے: سقوطِ ڈھاکہ کے وقت پنجاب بھی مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔

اب جو پنجاب ہمارے پاکستان میں ہے تو اس کے بھی درج ذیل تین حصے ہیں: سرائیکی، پوٹھوہاری اور مرکزی پنجاب۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف رامے: میں آپ کو ایک پُر لطف واقعہ سُناتا ہوں کہ میں نے اپنے ایک امیدوار دوست سے کہا کہ اگر پیپلز پارٹی کو انتخابات میں اکثریت مِل گئی تو وہ پنجاب کے وزیرِاعلیٰ بن جائیں گے۔

تو انہوں نے کہا کہ رامے صاحب: آپ اُس وقت وزیرِاعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے جب یہ بڑا صوبہ تھا۔ اب ہماری باری آئی تو آپ اصرار کر رہے ہیں کہ پنجاب تین حصوں میں تقسیم ہو جائے۔

ہاہاہاہا۔۔۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔

حنیف رامے: ہم نے اپنے مُلک کے استحکام کی خاطر دور اندیشی سے کام لینا ہے۔ ہم نے اپنے مُلک کی اساس اسلامی جمہوریہ کے نام پر رکھی لیکن ہم اس کو قومی ریاست کے طور پر چلا رہے ہیں۔ ریاست میں ہی کئی عناصر سیاسی نظریات کو مذہبی نظریات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔

قائداعظم نے اپنی 11 اگست کی تقریر میں امورِ ریاست، مذہبی آزادی، قانون کی حکمرانی اور مساوات کا پرچار کیا تھا۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف رامے: قائداعظم سے لے کر بھٹو صاحب کے دور تک مخلوط طریق انتخابات رائج تھا۔

نعیم طاہر: جی مخلوط طریق انتخابات رائج تھا۔

حنیف رامے: جنرل ضیاء الحق صاحب نے پیپلز پارٹی کو نقصان پہنچانے کے لیے جُداگانہ انتخابات کا نظام

متعارف کرایا اور ووٹر مسلم اور غیر مسلم میں تقسیم ہوگئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دوقومی نظریے کا تقاضا ہے

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ غیر مسلم اقلیتیں آبادی کے تناسب سے ایک الگ چھوٹے سے پاکستان کا تقاضا کر سکتے ہیں۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف رامے: اب دوسری جانب وہ مہاجرین ہیں جو بہار سے ہجرت کر کے پہلے بنگلہ دیش آئے اور پھر پاکستان منتقل ہوئے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی خانہ جنگی میں پاکستانی فوج کا ساتھ دیا۔ آج ان دوہری ہجرت کے تجربے سے گزرنے والے لوگوں کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں۔

نعیم طاہر: کوئی جگہ نہیں۔

حنیف رامے: اسرائیل بھی مذہب کے نام پر قائم ہوا، اس اعتبار سے کوئی بھی یہودی چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہو، اسرائیل کا شہری ہے۔

اگر ہم بھی اسلامی جمہوریہ ریاست ہیں تو مہاجر مسلمانوں کو کیسے اپنا شہری تسلیم نہیں کرتے۔

لیکن یہاں ان کا موقف ہے کہ نہرو لیاقت معاہدہ ایک محدود مدت تک کے لیے نافذ ہوا تھا اب اس معینہ مدت کے بعد کسی بھی مہاجر کو پاکستان آنے کی اجازت نہیں۔

قائداعظم اس بات کے خواہاں تھے کہ ملک میں جمہوری نظام لاگو ہو، مذہب کے نام پر کسی کا استحصال نہ ہو۔ ایک طرف ہم جمہوریت کے قائل ہیں اور دوسری جانب فرقہ واریت کے حامی ہیں۔

ان بہت سے مغالطوں کو علمی و عملی سطح پر ہمیں حل کرنا ہوگا۔

نعیم طاہر: ضروری ہے۔

حنیف رامے: تب کہیں جا کر ہم دنیا میں سر اُٹھا کر جینے کے قابل ہوں گے اور جن غُبار آلود سمتوں میں ہم کھو گئے ہیں ان دھندلی راہوں سے پاکستان کی ترقی اور فروغ کے لیے راستہ نکالنا ہے۔

نعیم طاہر: رامے صاحب بہت پُر لطف باتیں ہو رہی ہیں لیکن ایک بہت اہم بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں، کہ سیاست دان خواہ ان کا تعلق فوج سے ہو، کسی سیاسی جماعت سے ہو یا بیرونِ ملک سے ہو۔ ان سیاست دانوں کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

حنیف رامے: سیاست دانوں کا ذریعہ معاش۔۔۔۔؟

نعیم طاہر: قطع کلامی معاف۔ آپ نے اپنے خاندانی کاروبار کی آمدن کی معاونت سے سیاست میں پیسہ خرچ کیا۔ شیر باز خان مزاری نے اپنی زمینیں بیچ کر اخراجات پورے کیے۔ بہت سے سیاست دان جاگیردار ہیں اور جن سیاست دانوں کا ذریعہ معاش نادیدہ ہے وہ بدمعاش ہی بنتا ہے۔

حنیف رامے: دراصل معاملہ یہ ہے انتخابات پر بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ سیاست سے جمہوریت نافذ العمل ہوتی ہے ادارے قائم ہوتے ہیں۔ انتخابات خالصتاً الیکشن کمیشن کے زیرِ اہتمام ہونے چاہئیں تاکہ امیدوار صرف اپنی امارت کی وجہ سے سیاست میں نہ آئے اور صرف مال و متاع کی بنیاد پر کامیاب نہ ہو۔

ہماری سیاسی جماعتوں میں امیدوار بھی یہی سوچ رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے بڑے بڑے سیاسی رہنما بھی اپنے ذاتی مفاد کے لیے ہیں بلکہ اپنی سیاسی جماعت کے لیے رشوت مانگتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کا حساب کتاب نہیں ہوتا۔

نعیم صاحب ایک اور اہم بات جن سیاسی جماعتوں کے طور واطوار جمہوریت پر مبنی نہیں وہ برسرِ اقتدار آکر کبھی جمہوریت نافذ نہیں کراسکتے۔ انہوں نے جمہوری چلن سیکھا ہی نہیں ہوتا۔

میں آپ کے ساتھ محوِ گفتگو ہوں جبکہ لوگ انتخابات کی مہم میں سرگرم عمل ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ گذشتہ دنوں میرے کچھ آپریشن بھی ہوئے اور طبیعت علیل رہی۔

نعیم طاہر: اب آپ کی صحت کیسی ہے؟

حنیف رامے: اب میں روبصحت ہوں اسی لیے اتنی دیر سے آپ کو برداشت کر رہا ہوں۔

نعیم طاہر: ابھی تو اور بھی دیر ہے۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔

حنیف رامے: جی تو جانِ من صورتِ حال یہ ہے۔ میں اپنی طبیعت کی ناسازی کے دوران بستر پر پڑے اس سوچ بچار میں رہا کہ میں اپنی سیاسی جماعت کی حکومت یا ہم نوا حکومت کا حصّہ بن کر اپنے ملک و قوم کے لیے چارہ سازی کر سکتا ہوں۔ بھٹو صاحب کے دور میں وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے عہدے پر فائز تھا۔ تو میں بہت سارے امور سے انہیں بے خبر رکھتا تھا۔ اب موجودہ حالات میں سیاسی جماعت کا رہنما وزیرِ اعظم بنتا ہے اور حکومت کے تمام معاملات کی باگ ڈور بھی اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے باقی تو سب کٹھ پتلی ہیں۔

ہماری جمہوری جماعتوں کی یہ روش ہے۔ سیاسی جماعتوں میں مشاورت کے بغیر ہی ملکی معاملات

کے متعلق اہم فیصلے طے ہو جاتے ہیں بعد ازاں سیاسی جماعتوں کی مُہر ثبت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں حکومت یا حکومتی اداروں کا حصّہ بن کر باتیں زیادہ ہوتی ہیں اور عمل کم۔

اس لیے ضرورت ہے کہ ہم معاشرتی انقلاب کی باتیں کریں۔ ہمارا معاشرہ جو حکومت بھی بناتا ہے، وہ بہت زیادہ زنگ آلود اور بوسیدہ ہو گیا ہے۔ اس کو صاف کریں۔ لوگوں کی سوچ اور رویوں میں مثبت تبدیلی لائیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تاریخ ہمیں دوبارہ اُس موڑ پر لے آئی ہے کہ بظاہر تو ہمیں محمد علی جناح کی کھوج میں ہیں لیکن ضرورت ہمیں سرسیّد احمد خان اور علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیات کی ہے۔

نعیم طاہر: رامے صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔

ابھی تو اور بھی بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ جیسی شخصیت جس نے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا، راہیں تلاش کی اور رستے متعین کیے۔ ملک و قوم کی بیش بہا خدمت کی۔ ابھی آپ سے بہت گفتگو کی گنجائش ہے، لیکن آئندہ انشاءاللہ جب موقع ملے گا۔

حنیف رامے: جی ضرور موقع ملے گا۔

نعیم طاہر: میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ اگرچہ آپ کی طبیعت ناساز تھی لیکن اب روبصحت ہیں اور ہمارے ناظرین بھی بہت خوش ہوں گے۔ آپ سے گفتگو کا یہ سلسلہ انشاءاللہ جاری رہے گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

حنیف رامے: میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اگر میری گفتگو سے اس ملک و قوم کے مفاد کی خاطر کوئی ایسا پہلو نکل آئے جس سے ہم منزل کی جانب گامزن ہو جائیں۔ اس سے اچھی میرے لیے کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ میں آپ کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس بات چیت کا موقع دیا۔ بہت بہت شکریہ۔۔

☆☆☆

Scanned with CamScanner

اختتامیہ: ناظرین تاریخ کے اہم گواہ حنیف رامے کی گفتگو سے آپ کو تاریخ کے بارے میں ایک نئی فہم پیدا ہوئی ہوگی۔ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے تاریخ کا ادراک ضروری ہے اور ہمیں ایسے تاریخ کے گواہوں کی ضرورت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ جو آپ کے اور ہمارے سامنے راست بازی سے کام لیں۔

بہت بہت شکریہ۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔

نعیم طاہر

☆☆☆

عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی

ابتدائیہ:

کُچھ لوگ اپنی محنت، جدوجہد اور بے پناہ ایثار و قربانی دینے کے بعد دنیا سے اپنی شخصیت کا لوہا منوا لیتے ہیں۔ایسے لوگوں کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرتی ہیں اور آنے والے نسلیں ان کے کارناموں پر فخر کرتی ہیں اور یہی تاریخ ساز اور عہد ساز شخصیات قرار پاتی ہیں۔

دُنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کے سامنے کوئی بُلند مقصد ہو اور وہ اس کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دینے میں تامل نہ کریں۔ایسی ہی شخصیات سے قوموں کی زندگی کے چراغ روشن رہتے ہیں اور انہیں شخصیات سے ملکوں کی تاریخیں بنتی ہیں۔ایسے انسانوں کی زندگی خدمت سے عبارت ہوتی ہے وہ شہرت کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے لیے اپنی توانائیاں وقف کرتے ہیں۔

آج ہمارے درمیان ایسی ہی ایک عظیم شخصیت موجود ہے جن کی تمام زندگی خدمت سے عبارت ہے۔ انسانیت سے محبت و خدمت کے اس روشن باب نے دُنیا بھر کے لوگوں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ بھی عبدالستار ایدھی کو ''مہربان فرشتہ''، ''فادر ٹریسا'' اور پاکستان کی سب سے پسندیدہ شخصیت قرار دیتے ہیں۔محترم عبدالستار ایدھی کی خدمات کا دائرہ ملکی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح تک پھیلا ہوا ہے اور اس خدمت خلق کا مقصد اُولیٰ انسانیت ہے، جو ہر رنگ، نسل، زبان، مذہب اور مسلک کی قید سے قطعی آزاد ہیں۔

بلاشبہ عبدالستار ایدھی صاحب دُکھی انسانیت، بیواؤں، یتیموں، گھر بدر والدین، نفسیاتی مریضوں، لاوارث لاشوں کے غُسل، کفن دفن، بے گھروں، غریبوں، لاوارث بچوں غرض ہر قسم کی سسکتی و بلکتی انسانیت کے لیے رحمت کا فرشتہ ہیں۔

میں آج کے اس پروگرام میں عبدالستار ایدھی صاحب کو نہایت صدقِ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

جب ہم ان کے فلاحی ادارے پہنچے تو عبدالستار ایدھی صاحب اپنی شریکِ حیات محترمہ بلقیس ایدھی کے ہمراہ وہاں پہلے سے ہی موجود تھے۔ہمارے مابین بات چیت کا سلسلہ جاری تھا کہ اسی دوران ایدھی صاحب کو دادرسی کی غرض ایک ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔فون کرنے والے صاحب سے ادارے کے گوشوارے میں سے چھبیس ہزار روپے کی خُرد بُرد ہوگئی۔تو عبدالستار ایدھی صاحب نے کہا کہ ان پیسوں کی فِکر نہ کرو بلکہ جس کارکن کے ہاتھوں یہ خسارہ ہوا ہے اس کو تشفی دو۔

پھر کچھ ہی دیر میں بلقیس ایدھی صاحبہ ایک علیل بچے کو گود میں بہلاتے ہوئے اندر تشریف لائیں۔اس بچے کے چہرے پر اطمنانیت واضح نظر آرہی تھی۔

ہم نے دن بھر اس طرح کے بہت سے دل سوز واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

گفتگو:

نعیم طاہر: ہندوستان کے شہر گجرات کے علاقے ''بانٹوا'' سے پاکستان ہجرت کرنے کی داستان ارشاد فرمائیں اور کیسے ایک عام آدمی نے سماج کے لوگوں کے ہر دُکھ درد بانٹنے کا فیصلہ کرلیا؟

عبدالستار ایدھی: تقسیم ہندوستان کے بعد 6 ستمبر 1947 کو ہمارا خاندان بذریعہ بحری راستے کراچی پہنچا۔

اس وقت میری عُمر 19 برس تھی۔

لیاری کا علاقہ "میٹھادر" ہمارا مستقر ٹھہرا۔

میں نے اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے کاروبار شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں اگلے ہی روز 7 ستمبر کو کپڑوں کی فروخت کا کام بطور کمیشن ایجنٹ شروع کیا۔ جب میں کپڑا خریدنے مارکیٹ گیا تو کپڑا مارکیٹ میں ایک شخص نے دوسرے کو خنجر مار دیا اور وہ زخمی حالت میں زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ موقع پر موجود لوگ زخمی کے گرد گھیرا ڈال کر تماشہ دیکھنے لگے لیکن میرا دل اس کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے کی فکر میں مضطرب ہو گیا۔

اس زمانے میں ایمبولینس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی گاڑیاں زیادہ تعداد میں تھیں۔

بیشتر دُکانیں بند رہتیں اور آبادی بہت کم تھی۔ میں نے بہت تگ و دو کر کے ایک گھوڑا گاڑی کا بندوبست کیا اور زخمی شخص کو اس میں منتقل کر کے سول ہسپتال پہنچایا۔ پاکستان بنے ابھی پندرہ سال ہی ہوئے تھے اور ہسپتال میں علاج معالجہ کا مناسب انتظام بھی نہیں تھا لیکن ایک نیا آزاد ملک بننے کی

خوشی میں مریضوں کو فوری طبی امداد فراہم کرنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے میں ڈاکٹر جوش و جذبے کے ساتھ مصروفِ عمل تھے۔

ڈاکٹروں نے اس زخمی شخص کی بھی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔

نعیم طاہر: آپ کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کا تعلق کس مذہب سے ہے؟ ہندو، سکھ، عیسائی، مسلمان یا کوئی اور؟

عبدالستار ایدھی: انسانیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

عبدالستار ایدھی: میری ماں نے بھی ہمیشہ مجھے انسانیت کا درس دیا۔

نعیم طاہر: کیا آپ سوچتے ہیں کہ آپ نے اپنے لیے جو راستہ چُنا اس فیصلے میں آپ کی والدہ کی تربیت کا گہرا اثر ہے؟

عبدالستار ایدھی: بالکل اثر ہے۔ حقیقت میں ماں کی گود ہی بچے کی تربیت گاہ ہوتی ہے۔ اسی تربیت پر بچے کی شخصیت پروان چڑھتی ہے اور وہ اسی طرز پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ بچہ روایات و اقدار اور اخلاق و کردار اور انسانیت کا درس بھی ماں سے ہی سیکھتا ہے۔

ماں کے رُوپ میں بحیثیت خاتون کی سماج کی تئیں ایک اہم ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اچھی تربیت دیں۔ میری اماں مجھے دو پائی دیتی تھی۔ اس زمانے میں پائی کی مالیت پندرہ سے بیس روپے کے برابر تھی۔ میری اماں ساتھ میں تاکید بھی کرتی تھیں کی ایک پائی تمہارے ذاتی خرچ کے لیے ایک پائی تم کسی مستحق بچے پر خرچ کرنا۔ حسبِ معمول جب میں سکول سے گھر واپس آتا تو مجھ سے دو پائی کا حساب مانگتی۔

نعیم طاہر: اچھا حساب بھی مانگتی۔

عبدالستار ایدھی: جی حساب بھی رکھتیں تھیں۔ کبھی کبھار میں کہہ دیتا کہ آج دو پائی میں نے اپنی ذات پر ہی خرچ کر لیے تو وہ سخت ناراض ہوتیں اور تنبیہہ کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں جہاں معاملہ فرائض کا ہو، وہاں محبت کی نصیحت سے زیادہ تاکید اکید ہمیشہ خنجر کی طرح دل میں اُترتی ہے۔ بیٹا نہ کبھی غریبوں کا مال کھانا اور نہ ہی امانت میں خیانت کرنا۔

نعیم طاہر: یہ بڑی دل آویز بات ہے کہ آپ کی والدہ آپ کو اس کا احساس دلاتی تھیں کہ ایک پائی غریب بچے

Scanned with CamScanner

کی امانت ہے اور اس میں خیانت نہیں کرنی۔

عبدالستار ایدھی: میری والدہ باقاعدگی سے پائی پائی کا حساب مانگتی رہتی تھیں۔ تو یہ میری والدہ کا پہلا سبق تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: جب ہم پاکستان آئے تو میں نے دیکھا کہ یہاں ذات پات کا نظام عُروج پر تھا۔ میرا تعلق "بانٹوا میمن" برادری سے ہے میں نے بھی اپنی برادری کی فلاح و بہبود کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن یہ امر میرے لیے باعث اطمینان نہ تھا کیونکہ نسلی تفاخر آپس میں انقسام کا سبب بنتی ہیں اور آپس میں بگاڑ پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ سب سے پہلے میں نے کراچی میں غریب لوگوں کے لیے مفت دواخانہ کھولا۔ میری برادری کے لوگوں نے یہ طے کیا کہ جس شخص کے پاس ہماری جماعت کی پرچی ہوگی اس کو مفت طبی سہولت فراہم کی جائے گی۔ اس بات پر میرا برادری سے اختلاف ہو گیا۔

نعیم طاہر: کیا اختلافِ رائے ہوا؟ ذرا وضاحت کیجئے۔

عبدالستار ایدھی: میں نے کہا انسانیت کی خدمت میں کسی بھی قسم کی پرچی کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ جس شخص کو 103 یا 104 بُخار ہو وہ پرچی کی تلاش میں کہاں بھٹکتا رہے گا۔ میں نے کہا اس ڈھب سے کام کرنا میرا مزاج نہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: میں نے برادری کی میٹنگ میں اپنی دلیل واضح الفاظ میں پیش کی کہ عوام کو ذات پات کی بُنیاد پر منقسم خدمات نہیں کر سکتا۔

نعیم طاہر: جھگڑا بڑھ گیا؟

عبدالستار ایدھی: اختلاف اس حد تک تجاوز کر گیا کہ مجھے اشتعال پسند (Communist) شخص کہا جانے لگا۔ اس وقت نظریہ اشتراکیت کا چرچا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: ہر دور میں کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر زیرِ بحث تو رہتا ہے نہ۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔

عبدالستار ایدھی: میں نے کہا کہ تم اتنے بڑے صنعت کار اور سرمایہ دار ہو، برادری کی بیوہ عورتوں کی لاچاری

سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہیں بھٹے پر کام دیتے ہو۔ ان کی زندگیاں تباہ و برباد کر دیتے ہو۔ میری یہ بات سُن کر برادری والوں نے مجھے اشتراکیت پسند شخص کہا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: دیکھیں میں تو لفظ اشتراکیت کے معانی سے بھی شناسا نہ تھا۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔ اچھا۔

عبدالستار ایدھی: میری یہ گفتگو سُن کر ایک بہت بڑے سرمایہ دار نے مجھے جوتا مارا اور میں وہاں سے بھاگ گیا۔

نعیم طاہر: مارا آپ کو۔

عبدالستار ایدھی: جی۔ وہیں سے میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں غریبوں کے لیے ایک مفت دواخانہ بناؤں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ پھر میں نے لوگوں سے فُٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر بھیک مانگی اور قریباً چوبیس یا پچیس روپے جمع کیے۔ مفت دواخانہ کے لیے جگہ کا انتظام کیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: پھر اس کے بعد عید قربان پر لوگوں سے کھالیں ہدیہ کرنے کی التماس کی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: لوگوں نے اس معاملے پر بھی احتجاج کیا۔

نعیم طاہر: احتجاج کیا؟

عبدالستار ایدھی: جی۔ لیکن میں نے اس بات کی بالکل بھی پرواہ نہیں کی۔ میں نے آخر کار چار یا پانچ سو روپے کی کھالیں جمع کر لیں اور ساتھ ہی ساتھ فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر لوگوں سے خیرات بھی مانگی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: میرے اندر اس مُہم کو پورا کرنے کے لیے بہت زیادہ جوش و جذبہ تھا۔

نعیم طاہر: بالکل صحیح۔

عبدالستار ایدھی: میں اس حقیقت سے تو آگاہ تھا کہ زندگی میں اپنے مقصد کے حصول میں کٹھن راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہر حال میں نے ساڑھے چار ہزار روپے جمع کر کے پرانی گاڑی (PICKUP)

Scanned with CamScanner

خریدی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: اس میں ایک اسٹریچر نصب کیا۔ ایک ڈرائیور اجرت پر رکھا اس سے گاڑی چلانا سیکھا۔ ایمبولینس بھی چلائی۔ اپنی چھوٹی سی دُکان کے باہر چارپائی بچھا کے رکھتا تھا وہیں سو جاتا تھا۔ جیسے ہی کسی حاجت مند کا دست گیری کے لیے ٹیلی فون آتا فی الفور گاڑی لے کر موقع پر پہنچتا اگر مریض ہوتو ہسپتال لے جاتا اور اگر میت ہوتو گھر تک پہنچا دیتا۔

اس وقت لوگ استفسار کرتے کہ ایدھی صاحب آپ کی کیا اجرت ہے؟

تو میں جواب دیتا کہ انسانیت کی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں ہوتا۔

نعیم طاہر: چندے کی رقم سے آپ ادارے کی ضروریات پوری کرتے تھے لیکن اپنی خدمات بلا معاوضہ سرانجام دیتے تھے۔

عبدالستار ایدھی: جی میں خدمات کا معاوضہ وصول نہیں کرتا۔ لوگوں میں اس حوالے سے شعور اور آگہی پیدا کرتا تھا کہ اگر آپ دو روپے، تین روپے یا پانچ روپے کی بھی بخشش دینا چاہتے ہیں تو میرے دفتر میں جمع کروا دیں، یہ بات میرے لیے زیادہ منفعت بخش تھی۔

آج بھی زیادہ چندہ دینے والے وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ آپ نے پینتالیس برس پہلے میری والدہ کو رات کے تین بجے ہسپتال سے گھر پہنچایا اور آپ نے خود گھر کی تیسری منزل تک اسٹریچر لے جانے میں ہماری مدد کی۔ آپ کی اس خدمت کو فراموش نہیں کر سکتے۔

نعیم طاہر: جی بالکل درست ہے۔ خدمت فراموش کرنا ناممکن ہے۔

عبدالستار ایدھی: دنیا کا حقیقی انقلاب امن، محبت اور حقوق العباد میں نہاں ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

عبدالستار ایدھی: اس حقیقت کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔

نعیم طاہر: ایدھی صاحب آپ کے اس جذبہ انسانیت کو پروان چڑھانے میں آپ کے والد کا کیا کردار ہے؟

عبدالستار ایدھی: میرے والد صاحب نے مجھے ہمیشہ سادہ روٹی کا درس دیا۔ اکثر اس موضوع پر ان سے تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ میرے والد صاحب مجھے اجتماعی نیکی کی ترغیب دیتے کیونکہ ان کے خیال مسلمان قوم میں اس کا فقدان ہے۔

میں ہمیشہ ان سے پوچھتا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ والد صاحب کہتے کہ یہ منقسم قوم ہے ٹکڑوں میں بانٹ بانٹ کر لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ دوسری جانب ثواب کا نعرہ لگاتے ہیں۔ مساجد و مدارس کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس قوم میں رہ کر تم اپنے مقصد کی تکمیل نہ کر پاؤ گے۔

اس کے باوجود میرے والد صاحب نے مجھے اس کارِ خیر کو جاری رکھنے کی اجازت دی۔

نعیم طاہر: ہم نے جن ایدھی فلاحی مراکز کا مشاہداتی دورہ کیا وہاں ایک ہی سلوگن لکھا ہوتا ہے۔ ''انسان سے محبت کیجیے۔'' کیا یہی آپ کی زندگی کا عملی پیغام ہے؟

عبدالستار ایدھی: معاشرے میں امن و آشتی کے فروغ کے لیے بھی یہی پیغام ہے۔ مذہب اسلام انسان دوستی اور عظمت انسانیت کا علمبردار ہے، اور مخلوق تو اللہ کا کنبہ ہے۔

نعیم طاہر: آپ نے بالکل درست فرمایا۔

عبدالستار ایدھی: صرف خدمتِ خلق سے معاشرے کے بہت سارے مسائل جیسا کہ غُربت، ظلم و ستم اور معاشرتی ناانصافی وغیرہ ختم ہو سکتے ہیں۔

نعیم طاہر: سرسیّد احمد خان صاحب نے جب علی گڑھ کالج کی تعمیر کے لیے چندا اکٹھا کرنا شروع کیا تو کُچھ لوگوں نے ان پر جملے کسے، تلخ و تُرش باتیں کیں، مُسخر کرتے تھے۔ سرسید احمد خان صاحب کا چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے بازار میں سے گُزر ہوا تو ایک شخص نے کہا کہ پہلے ٹُھمکا لگا کے دِکھاؤ پھر چندہ دینے کا سوچیں گے۔

سرسیّد احمد خان جیسے بزرگ داشت اور بااِستعداد شخصیت نے اس کو ٹُھمکا لگا کر دِکھایا۔ وہ شخص اپنی اس حرکت پر نادِم ہوا اور سارے بازار کے پُر زور اصرار پر اُسے چندہ دینا پڑا۔ کیا آپ کو اس مہم جوئی میں ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

عبدالستار ایدھی: نہیں، مجھے اس قسم کی دُشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں کشکول ہاتھ میں لیے سڑک کے کنارے کھڑا ہو جاتا تھا اور لوگ مجھے دِل کھول کر چندہ دیتے تھے۔ اس میں لاہور شہر کی بہت بڑی مثال ہے۔

نعیم طاہر: اچھا لاہور کی؟

عبدالستار ایدھی: صرف نو گھنٹے کے اندر دو کروڑ روپے چندا اکٹھا ہوا دُنیا بھر میں اس مختصر وقت میں اتنی بڑی رقم اکٹھی کرنے کی سب سے منفرد مثال ہے۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: لاہور میں نو گھنٹے کے قلیل وقت میں دو کروڑ روپے کی زرِ خطیر جمع ہوئی۔ میرا تعلق بھی لاہور سے ہے، اور مجھے شہر لاہور اور اس کے باسیوں پر بہت فخر ہے۔ اللہ پاک ان سب لوگوں کو اس نیک عمل کی جزائے خیر سے نوازے۔

اچھا یہ بتایئے کہ کیا کبھی بیرونی ممالک، امداد دینے والے ادارے یا یو۔این۔او (United Nation Organization) کی جانب سے بھی مالی مدد کی پیشکش ہوئی؟

عبدالستار ایدھی: میں نے جب اس کارِ خیر کا آغاز کیا تھا تو میں نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ کسی سرکاری افسر یا بیرون ملک سے مالی مدد نہیں لوں گا۔ صرف پاکستانیوں سے چندہ لوں گا غرض کہ سڑک پر کھڑے ہو کر بھیک ہی کیوں نہ مانگوں۔ میرا آج بھی یہی اصول ہے۔ اب لوگوں میں شعور اور احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اب لوگ از خود چندے کی رقم ادارے میں جمع کروا دیتے ہیں۔

نعیم طاہر: آپ کی بات کا مطلب ہے کہ آپ کے پاس جتنی چندے کی رقم ہے وہ صرف پاکستانیوں کی ہے۔

عبدالستار ایدھی: جی فقط پاکستانیوں کے علاوہ میں کسی سے مدد نہیں مانگتا۔ دنیا بھر سے مجھے مالی مدد کی پیشکش ہوئی۔

روم میں پاپ پال (POPE PAUL) کے گرجا گھر والوں نے کہا کہ آپ ہمیں صرف ایک خط لکھ دیں ہمارے گرجا گھر سے لاکھوں ڈالر کی رقم آپ کے ادارے کو دیں گے۔ میرا بیٹا اور تہمینہ درانی بھی اس موقع پر موجود تھیں۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میری قوم میری مالی اعانت کرتی ہے، مجھے کسی کی مدد درکار نہیں ہے۔

امریکہ کی ہلٹن فاؤنڈیشن (Conrad N. Hilton Foundation) نے خط لکھا کہ وہ مجھے سالانہ ایک ملین دس لاکھ ڈالر کی خطیر رقم عطیہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اپنی قوم کو غیر ملکوں میں کیوں نادم کروں جبکہ میری قوم مجھے چندہ دیتی ہے۔

میرا یہ مقصد بھی تھا میں نے اپنی قوم سے انسانیت کی خدمت اور انسانوں سے پیار و محبت کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

میرے لیے اس عزم و ارادہ کی تکمیل اللہ پاک کی مہربانی و مدد کے بغیر ناممکن تھی۔ اللہ پاک کو مجھ سے یہ کام لینا تھا پس ہر قدم پر اللہ پاک کی خاص مہربانی اور نصرت و امداد شاملِ حال رہی۔

نعیم طاہر: ایدھی صاحب آپ نے اپنی قوم کے سامنے تو ہاتھ پھیلانا پسند کر لیا لیکن کسی دوسری قوم، ملک یا

ادارے کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ ایسا ملک کے وقار یا آپ کی عزتِ نفس نے گوارا نہ کیا؟

عبدالستار ایدھی: میرا احساسِ خودداری اس میں شامل ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے پانچ لاکھ اور تین ماہ پہلے سندھ کے گورنر نے بھی مجھے پانچ لاکھ کی رقم عطیہ کی۔ میں نے یہ کہہ کر واپس بھیج دیے کہ مجھے ملک کا پیسہ نہیں چاہیے۔ میں اپنے عوام کی خدمت، عوام کی مالی اعانت سے ہی کرتا ہوں۔

نعیم طاہر: ایدھی صاحب میرے اندازے کے مطابق آپ کا چالیس سے پچاس کروڑ روپے کا تصرف ہوگا۔

عبدالستار ایدھی: اس سے بھی زیادہ۔۔۔

نعیم طاہر: اور یہ سارا خرچ پاکستانی قوم کے پیسوں سے ہوتا ہے؟

عبدالستار ایدھی: مجھے نوے فیصد چندہ پنجاب کے لوگ دیتے ہیں چاہے وہ دُنیا کے کسی بھی خطے میں آباد ہوں۔ میری یہ جستجو ہے کہ میں دوسری برادری کی عوام کو بھی اس جانب راغب کروں۔ ہمارے ہاں اُردو سپیکنگ، میمن اور دوسری برادریوں کے بھی لوگ ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ برادریوں کی تفرقہ جوئی اور تنگ نظری کی سوچ کو بدل ڈالیں اور خدمتِ انسانیت کو اپنا شعار بنائیں۔

نعیم طاہر: ایدھی صاحب میری معلومات کے مطابق دنیا بھر میں ایدھی فاؤنڈیشن کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔ امریکہ، انگلستان، جاپان، آسٹریلیا، بنگلہ دیش، نیپال، جرمنی، فرانس اور دوبئی وغیرہ۔

عبدالستار ایدھی: دُنیا کے 37 ممالک میں ایدھی فاؤنڈیشن ہر مصیبت اور مشکل وقت میں اہم مدد فراہم کرتی ہے۔ دُنیا بھر میں جہاں پاکستانیوں کے سو گھر ہیں وہاں ہمارا ادارہ ضرور ہوگا۔

ان ممالک میں پاکستانی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ہمارے ساتھ ٹیلی فون پر رابطے میں رہتے ہیں۔ جہاں مدد کی ضرورت ہو بذاتِ خود متاثرہ جگہ پہنچ جاتے ہیں۔

نعیم طاہر: ماشاءاللہ۔ یہ بہت حیرت انگیز بات ہے۔ پاکستانی قوم آپ کی قیادت میں اپنی اس مدد پر فخر کر سکتی ہے۔ دُنیا بھر میں آپ کے مراکز خدمتِ خلق میں سرگرمِ عمل ہیں۔ حکومت یا بیرونی ممالک سے امداد بھی نہیں لیتے۔ یہ سب عوام کی نیک نہادی اور محنتِ شاقہ کا ثمر ہے۔ دُنیا بھر سے حاجت مند مشکل کی گھڑی میں ایدھی صاحب کو ہی مدد کے لیے پکارتے ہیں۔

عبدالستار ایدھی: اس حوالے سے دُنیا بھر سے پاکستانی قوم کو سراہا گیا ہے۔ دُنیا بھر میں دو بڑے فلاحی ادارے ہیں۔ ہلال احمر اور ایدھی فاؤنڈیشن۔ یہ سب اللہ پاک کا کرم اور مہربانی ہے۔

نہ صرف پاکستان کے طول و عرض بلکہ دُنیا بھر میں ایک ٹیلی فون کال پر دست گیری کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سب اللہ کا کمال ہے کہ اُس نے اس کارِ خیر کو منتہائے کمال تک پہنچایا۔

نعیم طاہر: ایدھی صاحب جیسا کہ آپ نے بتایا کہ اس کارِ خیر کے آغاز میں آپ کو اشتراکیت پسند کہا گیا جبکہ آپ کو اشتراکیت کا مطلب بھی معلوم نہ تھا۔ آپ کا اختلاف ہوا، آپ سے ناراض بھی ہوئے اور جوتا بھی مارا گیا۔ لیکن آپ نے اس تکلیف دہ اور پریشان کن واقعہ کو خدمت انسانیت کی صورت میں عظیم عبادت میں بدل دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں خدا کی کوئی مصلحت تھی۔

عبدالستار ایدھی: میں نے ان کو برادریوں کی بانٹ کے بغیر انسانیت کی خدمت کر کے دکھائی۔ میں بالکل ان پڑھ ہوں۔ گجراتی زبان کے علاوہ مجھے کوئی اور زبان نہیں آتی۔ اب اُردو زبان پڑھنا سیکھ رہا ہوں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ اُردو لکھ بھی لیتے ہیں۔

عبدالستار ایدھی: اُردو لکھ نہیں سکتا۔ میں ابھی بھی "انسانیت اور مذہب" کے موضوع پر گجراتی زُبان میں کتاب لکھ رہا ہوں۔ ہم اپنے کارکنوں کو بھی انسانیت سے محبت کا درس دیتے ہیں۔

نعیم طاہر: آپ نے سیاست میں بھی حصّہ نہیں لیا؟

عبدالستار ایدھی: آزاد امیدوار کے طور پر میں نے حصّہ لیا۔ اس وقت میمن برادری بھی میری حمایت کرتی تھی۔ لیکن میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ انتخابات کی بُنیاد برادری یا قبیلہ نظام جمہوریت تھی۔ 56 برس بعد جنرل پرویز مشرف کا دور آیا جو راہ راست پر گامزن ہے۔ لیکن اس کی بھی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

عبدالستار ایدھی: صرف ایک ہی بات پر مُصر ہیں کہ وردی اتارو۔ ہمیں ملک کی بہتری کے لیے جنرل پرویز مشرف کے ہر کام میں تعاون کرنا چاہیے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہماری قوم میں احترامِ انسانیت کا فُقدان ہے۔ ہم فرقے، طبقات اور برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ بُرے لوگوں کی بُرائی کو اپنی بھلائی سے دُور کر دو۔

نعیم طاہر: یہ بالکل دُرست بات ہے۔

عبدالستار ایدھی: یہ اللہ کا بھی پیغام ہے کہ: بھلائی پھیلاؤ اور بُرائی کو بھی بھلائی کے ساتھ دور کرو۔

انسان سے ہی انسانیت کی تکمیل ہے اور انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب ہے۔ اور اس مذہب کا معبود اللہ پاک ہے اور جہاں اللہ ہوتا ہے۔ وہاں صرف بھلائی ہی پھیلتی ہے۔

نعیم طاہر: ایدھی صاحب یہ بتایئے کہ اس مُہم کے دوران آپ کو کس طرح کی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

عبدالستار ایدھی: طاہر صاحب، باہمی تفاوت کے رویے میرے لیے بہت آزردگی کا باعث بنے۔ لیکن بڑی سے بڑی مخالفت اور رُکاوٹ سے اللہ پاک مجھے پار کرتا گیا اور اختلافات کرنے والوں کو للکارا کہ دیکھو میں اپنے اَن پڑھ بندے سے اتنا عظیم کام لے رہا ہوں۔

آج ایدھی فاؤنڈیشن کے پاس ساڑھے سات ایمبولینس ہیں۔ جو مُلک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئیں ہیں۔

نعیم طاہر: کبھی سرکاری افسران سے اجازت نامہ نہ ملنا، کسی وقت لائسنس حاصل کرنے میں دُشواری یا کہیں دوا پہنچانے کے مسئلے پیش آتے ہیں۔

عبدالستار ایدھی: حاجی صاحب، سرکاری افسران فرشتہ صفت بھی ہیں۔

کبھی افسران کہتے بھی ہیں کہ آپ کو یہ کام کرنے کی اجازت کس نے دی۔ مثال کے طور پر ایک جھولے سے نکلا لاوارث بچہ ہم بے اولاد کو گود دیتے ہیں۔ جو بیرونِ مُلک رہائش پذیر ہیں۔ تو اس بات پر سوال اٹھاتے ہیں کہ تم کس کی اجازت سے بچہ ان کی سرپرستی میں دے رہے ہو۔ اُن کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی اس مُلک میں ہیں۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔ کارِ خیر کی اجازت نہیں اور بُرے کاموں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔

عبدالستار ایدھی: حاجی صاحب، ہمارے فلاحی ادارے کا باقاعدہ ایک تحریری منشور ہے اور اس کا عدالت میں باضابطہ اندراج بھی ہے۔

نعیم طاہر: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی غیر موجودگی میں بھی یہ تنظیم اسی طرح کام کرتی رہے گی؟ کیا آپ کا انتظامی نظام اتنا مضبوط ہے؟ کہ اس ادارے کے تمام امُور کی ذمہ داری سنبھال سکے۔

عبدالستار ایدھی: حاجی صاحب، میں اور میری بیگم ہمیشہ یہ سوچتے تھے کہ اتنا بڑا نظام ہے، ہمارا کمال یہ نہیں کہ ہم چلا کے چلے جائیں اور سب کو یتیم بنا دیں۔

اس حوالے سے ہم نے اپنے بچوں سے بات کی۔ ایک بیٹا امریکہ میں پڑھتا تھا۔ اس کے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں دریافت کیا؟

نعیم طاہر: جی۔

عبدالستار ایدھی: میں نے پوچھا کہ ہمارا کام پسند ہے۔ بولا جی ہاں۔ میں نے کہا کہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آجاؤ اور اس کام کو سمجھو اور سیکھو۔ میٹرک تو پڑھ چکے ہو مزید تعلیم آہستہ آہستہ مکمل کرتے رہنا۔

نعیم: وہ بھی تعلیم ہے۔

عبدالستار ایدھی: یہ بھی تعلیم ہے۔

نعیم طاہر: دیکھیے سکول وکالج میں ہم فزکس، کیمسٹری، ریاضی اور جیوگرافی وغیرہ جیسے مضامین پڑھتے۔ ان سے شعور تو حاصل ہوا لیکن جو زندگی نے سکھایا وہی کام آیا۔ اصلی تعلیم تو آدمی عملی میدان میں سیکھتا ہے۔

عبدالستار ایدھی: عمل سے زندگی بنتی ہے۔

نعیم طاہر: جنت بھی جہنم بھی ہے۔

عبدالستار ایدھی: اس سے آگے میں نہیں بولوں گا۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔۔

عبدالستار ایدھی: ہاہاہاہا۔۔۔عمل سے زندگی بنتی ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل بالکل۔

عبدالستار ایدھی: اگر ہمارے عمل اچھے ہیں تو اس دُنیا میں بھی ان کی جزا ملتی ہے۔

نعیم طاہر: جہاں پیسے کے معاملات ہوں وہاں دل میں بدگمانیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور لوگ اس کھوج میں رہتے ہیں کہ یہ پیسہ کن ذرائع سے آرہا ہے اور کہاں خرچ ہو رہا ہے؟
کیا آپ سے بھی ایسے سوال کیے جاتے ہیں۔

عبدالستار ایدھی: حاجی صاحب، بدگوئی کرنا ہماری قوم کی کمزوری ہے، ہم نے ان کے اندر اچھا انسان بننے اور خدمتِ انسانیت کا احساس ہی پیدا نہ کیا۔

نعیم طاہر: آپ کا اتنا بڑا ادارہ ہے اور اس کی اتنی شاخیں ہیں۔ جس میں خواتین اور بچے بھی رہائش پذیر ہیں۔ آپ کی بیگم صاحبہ محترمہ بلقیس ایدھی بھی آپ کے ساتھ شانہ بشانہ سرگرم عمل ہیں۔ آپ کی اجازت سے اُن کو بھی دعوت دینا چاہتا ہوں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ اس گفتگو میں شریک ہو جائیں

۔ میرا آپ سے ایک سوال ہے کہ کچھ لوگ آپ کو فرشتہ، کئی لوگ سائیں، فقیر یا سیدھا سادا انسان سمجھتے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

عبدالستار ایدھی: حاجی صاحب، بعض لوگ مجھے بُرا بھی سمجھتے ہیں۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔۔

عبدالستار ایدھی: لیکن اللہ نے ان مخالفین کو للکارا کہ دیکھو میں اس بوڑھے شخص سے کتنا بڑا کام لے رہا ہوں۔ جتنا تم حساب کتاب کر رہے ہو میں اتنا ہی اسے بے حساب نوازے جا رہا ہوں۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

عبدالستار ایدھی: میں آپ کو لندن کا ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ لندن میں مقیم پاکستانی مجھے سالانہ بارہ لاکھ پاؤنڈز کا چندہ دیتے ہیں جو پاکستانی بارہ کروڑ روپے بن جاتے ہیں۔ 11 ستمبر کے واقعے کے بعد پاکستانیوں اور عربوں کے لیے بہت مشکلات پیدا ہو گئیں تھیں۔ میں نے لندن سے دس لاکھ پاؤنڈ پاکستان منتقل کیے۔ تو ہمارے مخیّر کارکن گھبرانے لگے۔ میں نے اُن کو گجراتی میں خط لکھا کہ:
اگر آپ کو اپنے کاروبار یا یہاں کی قومیت (NATIONALITY) کھو جانے کا ڈر ہے تو آپ چلے جائیں۔ میں فقیر آدمی ہوں میں اپنے منصوبے کے لیے پوری دُنیا گھومتا رہتا ہوں اور مخیّر حضرات میری مدد کرتے رہتے ہیں۔ دُنیا بھر سے پیسے منگواتے رہنا تو میرا کام ہے۔

نعیم طاہر: بالکل ٹھیک۔

عبدالستار ایدھی: حاجی صاحب، ایسے بہت سے مسائل آڑے آتے ہیں۔ لیکن میں کبھی ہمت نہیں ہارا۔ میرا اور میری بیوی کا دل بھی ٹوٹتا تھا۔ بہر حال ہم نے ہمیشہ اللہ سے یہی دُعا مانگی کہ بڑے پیمانے پر (Whole Sale) دُنیا، خوردہ فروشی (Retail) کی طرح نہیں چاہیے۔

نعیم طاہر: جب اللہ سے مانگنا ہے تو بے حساب مانگیں تھوڑا کیوں مانگیں۔

عبدالستار ایدھی: اور اللہ نے بے حساب دیا۔

نعیم طاہر: جی بالکل کیونکہ آپ کی نیت ٹھیک تھی۔
اب میں بلقیس ایدھی صاحبہ کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ شریک گفتگو ہوں اور ہم دیکھیں کہ زندگی کے دونوں پہیے مل کر کس طرح اس کارِ خیر کو آگے بڑھانے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

عبدالستار ایدھی: میں مختصر عرض کروں کہ اس نیک کام میں ساٹھ سے ستر فیصد حصّہ بلقیس کا ہے۔ اس کے سنگ ساتھ سے ہی ہماری فاؤنڈیشن ترقی کی راہوں پر گامزن ہے میری بیٹی اور بیٹے بھی اس قافلے میں شامل ہوگئے ہیں۔

نعیم طاہر: ماشاءاللہ۔

عبدالستار ایدھی: اب مجھے امید ہے کہ یہ قافلہ دُنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن کرے گا اور یہ کارواں یونہی اس مشن کو آگے بڑھاتا رہے۔

بلقیس ایدھی: السلام علیکم۔

نعیم طاہر: وعلیکم السلام۔ میں اپنی، اور اپنے ناظرین کی جانب سے آپ کو اس پروگرام میں خوش آمدید کہتا ہوں۔

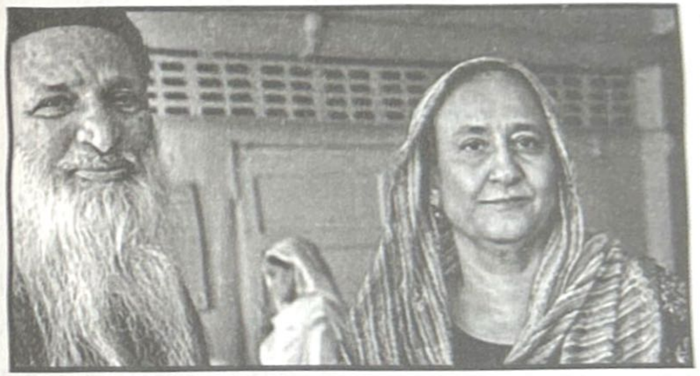

میں اپنے دیکھنے والوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بلقیس ایدھی صاحبہ نے آتے ہی ایدھی صاحب کی چڑھی ہوئی آستین کو اندر کی جانب ذرا سا موڑ دیا تو معلوم یہ ہوا کہ پروگرام میں وہ خاتون تشریف لائی ہیں جو نہ صرف نجی زندگی میں ایدھی صاحب کی دیکھ بھال کرتی ہیں بلکہ ان کے فلاحی کاموں میں شانہ بشانہ ہے۔

بہت بہت شکریہ آپ تشریف لائیں۔

بلقیس ایدھی: جی۔

نعیم طاہر: کل جب میں ایدھی صاحب سے فون پر گفتگو کر رہا تھا تو اس دوران مجھے خیال آیا کہ مجھ سے عُمر

میں بڑے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ انٹرویو کے دوران میری کسی بات پر غصہ آ جائے۔

میں نے لُطفاً ان سے سوال کیا کہ ایدھی صاحب کیا آپ کو غُصّہ بھی آتا ہے؟ تو کہنے لگے کہ تھوڑا سا آتا ہے۔

تو آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

بلقیس ایدھی: شادی سے پہلے تو بہت غصہ آتا تھا لیکن پھر قدرے کم ہوتا چلا گیا ابھی بھی پچاس فیصد مزاج میں غصہ ہے۔

نعیم طاہر: یہ آپ نے کیا بات کی کہ شادی کے بعد بھی غصہ آتا تھا؟ آپ پر بھی غصہ کرتے ہیں۔

بلقیس ایدھی: غصے میں ایک ہنگامہ برپا کر دیتے تھے۔ اگر دفتر میں کوئی آدمی ستائے تو اُوپر آ کے شور مچاتے اور مجھے بھی بُرا بھلا کہتے۔ ان کی ایک عادت تھی کہ جب ان کو غُصّہ آتا تھا تو کھانا پینا چھوڑ دیتے اور خاموشی اختیار کر لیتے۔

نعیم طاہر: او ہو۔ اپنی ہی ذات کو تکلیف دیتے۔

بلقیس ایدھی: ہم پہ بھی غصہ نکالتے تھے۔

نعیم طاہر: میری بیوی یاسمین طاہر نے بالخصوص آپ کو اور ایدھی صاحب کو سلام بھیجا ہے۔ وہ آپ دونوں کی دل کی گہرائیوں سے عزت کرتی ہیں۔

ایک بات ایدھی صاحب اور یاسمین طاہر کے مزاج میں مشترک ہے کہ وہ بھی غصے میں بالکل خاموش ہو جاتی ہیں۔ سارے گھر کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یاسمین چُپ ہیں تو ضرور کسی بات سے افسردہ ہیں۔ آپ کے بقول ایدھی صاحب بھی کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں۔

بلقیس ایدھی: کھانا پینا بھی چھوڑ دیتے ہیں اور چُپ ہو جاتے ہیں۔

نعیم طاہر: آپ نے یہ دُشوار گزار راستہ کیسے اپنایا؟

بلقیس ایدھی: میں جب ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھی تو ہمارے مُحلے کی لڑکیاں ان کے دفتر میں واقع ہسپتال میں نرسنگ سیکھنے جاتی تھیں۔ میں بھی اُن کے ہمراہ چلی جاتی تھی۔

نعیم طاہر: ایدھی صاحب آپ یہ بتائیے کہ آپ نے بلقیس ایدھی صاحبہ کو کیسے بطور شریک سفر مُنتخب کیا؟

عبدالستار ایدھی: جو بچے جھولے میں آتے تھے ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بلقیس ایدھی کی تھی۔ اور وہ بہت محنت سے دیکھ بھال کرتی تھیں۔

نعیم طاہر: جھولے میں بچے۔۔۔۔۔؟

عبدالستار ایدھی: یعنی ایسے بچے جن کو لوگ جھولے میں چھوڑ جاتے۔ ان بچوں کو اپنانا نہیں چاہتے۔

نعیم طاہر: جی۔ عبدالستار ایدھی:

میں نے ابھی اس کام کا آغاز ہی کیا تھا۔ تو لوگ معذور، بیمار اور لاوارث بچوں کو جھولے میں ڈال دیتے تھے۔ بلقیس ایدھی بہت پیار سے ان کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ میری عادت ہے کہ میں بہت صاف گو ہوں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: میں نے جب بلقیس کو پسند کیا تو میں نے براہ راست بلقیس سے کہا کہ ہم شادی کر لیں، تو اس نے غصے میں جواب دیا کہ آپ میری امی سے بات کریں مجھ سے ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔

بلقیس ایدھی: چھ، سات خواتین نے تو مجھے منع بھی کیا تھا۔

نعیم طاہر: چھ، سات خواتین نے۔۔۔۔۔ ہاہاہاہا۔

عبدالستار ایدھی: دس بارہ لڑکیوں کو تو میں شادی کا پیغام دے چکا تھا۔ لیکن کوئی میری باتوں کو اہمیت نہ دیتی تھی۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہاہاہا۔۔۔۔۔ آپ کو شاید ان کی گال میں پڑنے والے گڑھے پسند آئے تھے۔

عبدالستار ایدھی: آہ۔۔۔ مجھے سفید رنگت والی لڑکیاں پسند تھیں۔

نعیم طاہر: آپ کی کتاب میں تحریر ہے کہ بلقیس ایدھی صاحبہ رضاکارانہ طور پر اپنی خِدمات سرانجام دے رہیں تھیں۔ جب آپ کی نظر پڑی تو آپ کو بلقیس ایدھی صاحبہ کے گال کے گڑھے دل فریب لگے۔ آخر کار آپ بھی دل رکھتے ہیں نا۔۔۔۔

عبدالستار ایدھی: محبت کے بغیر تو انسان ادھورا ہے۔۔

نعیم طاہر: ایک رسالے میں پڑھ رہا تھا کہ آپ کی کوئی پُرانی محبت بھی تھی۔

عبدالستار ایدھی: میں نے ایسی کئی محبتیں کی ہیں لیکن ہمیشہ ناکام رہا۔

نعیم طاہر: محبت ہی کی ہے، نفرتیں تو نہیں بانٹیں نا۔

عبدالستار ایدھی: میری تو زندگی ہی محبت سے عبارت ہے۔

نعیم طاہر: (بلقیس ایدھی سے مخاطب ہوتے ہوئے)
ایدھی صاحب بہت سچے آدمی ہیں آپ کو تو سب معلوم ہی ہوگا کہ کِن کِن لڑکیوں سے محبت کی؟

بلقیس ایدھی: وہ سب بے چاری لڑکیاں ہمارے ساتھ ہی کام کرتی تھیں۔

نعیم طاہر: اچھا علی الصبح کس سے ملنے جاتے تھے؟

بلقیس ایدھی: یہ تو پاکستان آنے سے پہلے کی بات ہے۔

نعیم طاہر: لڑکپن کی بات۔

بلقیس ایدھی: جی پندرہ سولہ برس عُمر تھی۔

عبدالستار ایدھی: ابھی پاکستان نہیں بنا تھا۔

بلقیس ایدھی: وہاں بچیاں پانی بھرنے جاتی تھیں یہ نماز کے لیے جاتے تو کہیں راستے میں ہی کھڑے ہو جاتے ہوں گے۔

نعیم طاہر: تو راستے میں محبت ہو جاتی ہوگی۔ (مزاحیہ انداز میں)

باللقیس ایدھی: نہیں۔ (ہنستے ہوئے)

عبدالستار ایدھی: جس دِل میں محبت نہیں وہ انسان ہی نہیں۔

نعیم طاہر: اور جو محبت کا اقرار نہیں کرتا وہ دروغ گو ہے۔

عبدالستار ایدھی: اظہارِ محبت میں ڈرنا کیوں ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل کیسا ڈر۔

عبدالستار ایدھی: میں نے ہمیشہ سچ بولا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں چوری کرنا بہت آسان ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

عبدالستار ایدھی: میں آج کل ایک ہی قصہ آپ کو سُناتا ہوں۔ مجھے لاہور سے ٹیلی فون آیا کہ ایک لڑکی اسّی ہزار روپے اور سونے کا ہار لے کر مرکز میں آئی ہے۔ اس لڑکی کا تعلق ہارون آباد سے تھا۔ آج اُس لڑکی کے ماں باپ ہمارے پاس آئے کہ ہمیں وہ ہار واپس دو۔ ہم نے اُن دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کو کچھ غلط حرکتوں کی وجہ سے دو روز پہلے ہی نکال دیا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

عبدالستار ایدھی: تو ہمارے ہاں چوری اتنی آسان ہے کہ بچیاں والدین سے ناراض ہو کر جب گھروں سے

Scanned with CamScanner

بھاگی ہیں تو کچھ نہ کچھ چوری کر کے ضرور ساتھ لے جاتی ہیں۔

نعیم طاہر: پھر وہ کیا بیان درج کرواتی ہیں؟

عبدالستار ایدھی: ہر لڑکی کی باقاعدہ ایک فائل بنتی ہے۔ اگر ان کے پاس سونا ہے یا پیسا ہو تو لکھا جاتا ہے اور اگر پیسے ہوں تو ایک پرچی بنا کر فائل میں چسپاں کر دی جاتی ہے اور رخصت کے وقت ان لڑکیوں کی امانت ان کو سونپ دیتے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا! تو آپ ان کو کھانا دینا اور رہائش بھی دیتے ہیں؟

بلقیس ایدھی: انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو فیصد جھوٹ بول رہی ہیں اس کے باوجود ہم ان کی بات مان لیتے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا!

بلقیس ایدھی: اگر سو لڑکیاں آتی ہیں تو ان سب کا یہی بیان ہوتا ہے کہ ہمارے ماں باپ مر چکے ہیں اور ہم اپنی پھوپھی یا چاچی کے گھر رہتی ہیں اور وہ ہم پر بہت ظلم کرتی ہیں اور بعد میں حقیقت کھلتی ہے کہ سب کے والدین حیات ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا! جھوٹ بولتی ہیں۔ پھر آتی کیوں ہیں؟

بلقیس ایدھی: کچھ لڑکیاں شادی اور چند ایک پڑھنے کی غرض سے آتی ہیں کسی کا باپ سوتیلا یا کسی کی ماں سوتیلی ہوتی ہے۔ کسی کا باپ نشہ کرتا ہے۔ پہلے تو لڑکیاں عمران خان کی تصویر ساتھ لاتی تھیں اور آج کل کی لڑکیاں شہزاد رائے کی تصویر ہمراہ لاتی ہیں۔

نعیم طاہر: کس کی؟

بلقیس ایدھی: شہزاد رائے۔

نعیم طاہر: شہزاد رائے۔ ہاہاہا۔۔۔

بلقیس ایدھی: کہتی ہیں کہ ان سے ملاقات کرنی ہے۔

نعیم طاہر: اچھا! گھر جاتی کیسے ہیں؟

بلقیس ایدھی: ہم حقیقت جاننے کے لیے ان کی ہم عمر لڑکیاں کھوج میں لگا دیتے ہیں۔ جب ان کی دوستی ہو جاتی ہے تو وہ سچ بات بتا دیتی ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بلقیس ایدھی: چند دن پہلے مجھے فون آیا سولہ برس کی لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ اس میں اس صوبے سے ملی تھیں۔ یہاں بھی لڑکوں کے پیچھے گھر سے بھاگے تھے۔ میرپورخاص کی کسی ہندوؤں کی بستی سے آئی تھی۔ میں نے جب ان کے لیے چیک کیا تو اس میں سے مجھے ایک شادی کا کارڈ ملا۔ میں نے جب وہاں فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ ان دو لڑکیوں کی وجہ سے میرے گھر میں ابھی پولیس کا چھاپہ پڑا ہے۔ یہاں ساری مارکیٹ بند ہے۔ ان لڑکیوں کے ماں باپ نے دو تین ہندو لڑکوں کو حوالات میں بند کروا دیا ہے۔ یہاں ہم سب بہت مصیبت میں ہیں۔ اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔ میں نے اپنا پتہ لکھوا دیا اور کچھ دیر بعد پولیس کی گاڑیاں اور تین، چار گاڑیوں میں علاقے کے لوگ آئے اور ان دونوں کو لے گئے۔

نعیم طاہر: ایک اور بڑا مسئلہ ہے جب یہ خود بھاگ کر آتی ہیں۔

بلقیس ایدھی: اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ بچیاں ٹی وی میں کام کرنا چاہتی ہیں۔

نعیم طاہر: ٹی وی۔ ہاہاہا۔۔۔۔

بلقیس ایدھی: ہم کہتے ہیں کہ ہم خود آپ کو ٹی وی لے جائیں گے لیکن پہلے آپ اپنے گھر کا صحیح پتہ بتاؤ۔

نعیم طاہر: اچھا آپ زندگی کے مختلف میدانوں میں محاذ آرا ہیں اور ایک سب سے اہم ہدف تو ایدھی صاحب خود ہیں۔

بلقیس ایدھی: جی بالکل۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔۔۔ ہم تو سیدھے سادے سے گناہ گار لوگ ہیں۔ بار بار گناہ کرتے ہیں اور مان بھی لیتے ہیں۔
ایدھی صاحب تو اپنے مقصد کی دھن میں ہیں۔ سمندر میں سے اُن لاشوں کو بھی نکال لیتے ہیں جو ہاتھ لگانے سے گل جائیں۔ ان لاشوں کو سمیٹ کر عزت و تکریم کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں۔
سوسائٹی میں جو چیزیں تعفن پھیلاتی ہیں۔ جن کو لوگ ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتے۔ یہ ان سب گلی سڑی چیزوں کو اٹھا کر سوسائٹی کو صاف کرتے ہیں۔
تو زندگی کی کٹھن راہوں پر ایسے ہم سفر کے سنگ چلنا بڑا دشوار کام تھا۔

بلقیس ایدھی: آپ نہیں سمجھتے یہ سب اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے اتنا شعور اور سمجھ بوجھ عطا کی۔
شادی سے پہلے لڑکیاں مجھے کہتی تھیں کہ اللہ کے واسطے انکار کر دے۔ یہ شخص بہت ظالم ہے بند کر کے رکھے گا۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

بلقیس ایدھی: تو میں نے کہا کہ میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔ میں بھی بند نہیں رہوں گی اور واپس آجاؤں گی۔

نعیم طاہر: یہی جذبہ تھا کہ میں بھی کسی سے کم نہیں۔

بلقیس ایدھی: میں بچپن سے ہی بہت نڈر تھی۔ جب چھوٹی تھی تب بھی لڑتی تھی اور سب کو تھپڑ مار کر آتی تھی۔ دِل میں ڈر بھی لگتا تھا کہ کہیں امّی نہ پٹائی کر دیں۔

نعیم طاہر: تو پھر آپ نے کس حد تک اِس جن کو بھی قابو میں کرلیا۔

عبدالستار ایدھی: حاجی صاحب، اللہ کے فضل سے ایک کمال یہ ہوا کہ ان کا ہاتھ میرے اوپر سے کبھی نہیں اُٹھا۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

بلقیس ایدھی: اِن پر کبھی ہاتھ نہیں اُٹھایا۔

نعیم طاہر: اپنی محبت سے جیت لیا۔

بلقیس ایدھی: جی پیار و محبت سے جیت لیا۔

نعیم طاہر: آپ کی آمد سے پہلے ایدھی صاحب نے بتایا کہ اس فلاحی ادارے کو چلانے میں 67 فیصد حصّہ آپ کا ہے۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ساٹھ، پینسٹھ یا ستر فیصد کیوں نہیں کیا۔ انہوں نے 67 فیصد کا خاص حساب رکھا ہوا ہے۔ جو بہت بڑی بات ہے۔ ہم نے یہ سُنا کہ یہ نہاتے کم ہیں اور آپ کو اس عادت پر اعتراض بھی ہے؟

بلقیس ایدھی: پانچ وقت باقاعدگی سے نماز پڑھتے ہیں۔ وضو کرتے ہیں۔ انہوں نے بھلے نہانا چھوڑا ہو لیکن پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔

نعیم طاہر: کام میں بہت مشغول رہتے ہیں۔

بلقیس ایدھی: شب و روز کام میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ اِن کے دماغ میں جو بات بھی آجائے خواہ کھڑے ہی کیوں نہ ہو فوراً لکھتے ہیں۔

نعیم طاہر: پانی سے ڈرتے ہیں؟

بلقیس ایدھی: وضو کرتے ہیں۔ پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں۔

نعیم طاہر: بلندی سے ڈرتے ہیں؟

بلقیس ایدھی: نہیں۔

نعیم طاہر: کس سے ڈرتے ہیں؟

بلقیس ایدھی: کسی سے بھی نہیں اپنے مَن کے مالک ہیں۔

نعیم طاہر: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ مستقبل میں مزید خواتین اس فلاحی کام میں حصّہ لیتی رہیں گی۔

بلقیس ایدھی: جی بالکل۔ خواتین کا حصّہ لینا ضروری بھی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بھلائی کے کاموں میں مدد تو کرتے نہیں لیکن جو لوگ ان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں اِن پر فوری تہمت باندھ دیتے ہیں۔

☆☆☆☆

اختتامیہ:

میں بہت شُکر گزار ہوں کہ آپ نے ہمارے لیے قیمتی وقت نکالا۔ آپ نے تو اپنا سارا وقت لاوارث، لاچار، مصیبت زدہ لوگوں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔

جب ہمارے بے حس معاشرے میں بسنے والے بعض سنگ دِل لوگ لاوارث بچوں کو جھولے میں ڈال دیتے ہیں تو آپ ان لاوارثوں کے وارث بن کر سائبان فراہم کرتے ہیں۔ جب مُلک کے طول وعرض میں لاتعداد افراد زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں تو اس لمحے آپ کی نجی ایمبولینس سروس لوگوں کی اکھڑتی سانسیں بحال کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوتی ہیں۔ جب کبھی یتیم بچوں کے لیے یہ دُنیا تنگ ہو جاتی ہے یا ان کا جینا دوبھر ہو جائے تو آپ کا دستِ شفقت ان کے سروں پر پہنچ جاتا ہے اور جب ماں جیسی ہستی اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا بندوبست نہ کر سکے تو آپ کا لنگر ان یتیموں، بیواؤں اور غریبوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ جب کسی خاتون پر اس کو شوہر ظلم کرے یا گھر سے بے دخل کر دے یا ضعیف والدین پر ان کی اولاد گھر کے دروازے بند کر دیتی ہے تو اس گھڑی آپ کے شیلٹر ہومز کے دروازے ان پر بلا معاوضہ کُھل جاتے ہیں۔

ناظرین آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ ایدھی صاحب نے کئی مرتبہ مجھے حاجی صاحب کہا تو میں آپ سے عرض کرتا چلوں کہ میں نے وقفہ کے دوران اِن سے کہا کہ ایدھی صاحب آپ مجھے حاجی، حاجی کہہ رہے ہیں لیکن میں تو حاجی نہیں ہوں۔ حاجی تو آپ ہیں تو ایدھی صاحب کہنے لگے کہ میں بھی حاجی نہیں ہوں۔ میں بڑا حیران ہوا،

میں نے کہا کہ آپ تو حج کرنے گئے تھے۔ جواب میں ایدھی صاحب نے کہا کہ ''ہاں میں حج کرنے گیا تو تھا لیکن میں نے وہاں اتنے لوگوں کو مصیبت میں دیکھا کہ میں اُن کی مدد کرنے میں لگ گیا اور حج کے جو فرائض تھے وہ میں پورے نہ کر سکا۔'' میں نے دِل میں سوچا کہ ایدھی صاحب نے تو حجِ اکبر کر لیا، اس سے بڑی نیکی کیا ہے کہ انسان ہر قُربانی دے کر دوسرے انسان کی مدد کرے اور یہی ہے کردار ایدھی صاحب کا۔

میری یہ دُعا ہے کہ آپ کی گفتگو سُن کر ہماری قوم کو ذات پات سے بالاتر ہو کر اِنسان سے محبت اور خدمت انسانیت کی ترغیب مِلے۔

میں اپنی، اور پوری قوم کی جانب سے آپ کا تہہ دِل سے شُکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے دیکھا کہ اگر میرے یا آپ کے جیسا عام آدمی اپنے نصب العین کو پانے کا پُختہ ارادہ کر لے تو وہ قوم کی تقدیر بدل سکتا ہے اور تاریخ بھی رقم کر سکتا ہے۔ اس حوالے سے عبدالستار ایدھی صاحب کی زندگی ہمارے لیے بیش بہا مثال ہے۔ ایسے چراغ روشن رہنے چاہیں کہ معاشرے میں اندھیرا بہت ہے۔

بہت بہت شُکریہ۔ انشاءاللہ پھر مُلاقات ہوگی۔

نعیم طاہر

☆☆☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر جاوید اقبال

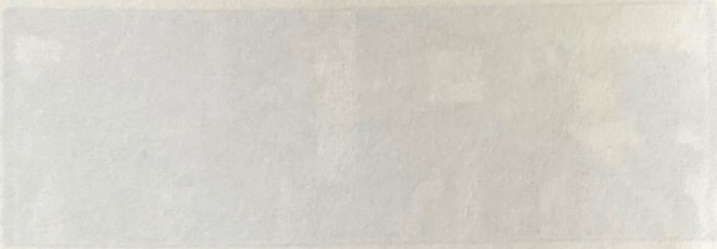

ابتدائیہ:

ناظرین آج کا دِن بہت اہم ہے۔ آج ہم ایک ایسی شخصیت سے گفتگو کریں گے جو علم و تحقیق و قانونی مہارت اور وضع داری کا ایک روشن باب ہیں۔ عام طور سے نامور تاریخی شخصیات کی اولاد کتنی بھی باصلاحیت ہو۔ بزرگوں کے اثاثے تلے دب کر رہ جاتی ہے۔ عام لوگ زندگی بھر ان کا موازنہ ان کے بزرگوں سے کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کچھ مستثنیات بھی ہیں۔ جیسے ڈاکٹر جاوید اقبال، اگر چہ ایک عرصے تک بطور فرزندِ اقبال ہی پہچانے گئے مگر پچھلے چالیس برس میں انہوں نے اپنی ایک علیحدہ شناخت بنائی۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی قانون وانصاف کے پیشے میں اعلیٰ خدمات ہیں۔ آپ نے قانون وانصاف کی بالادستی اور علم و فضل میں منفرد و اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ آپ ممتاز و قانون دان، محقق، فلاسفر، ادیب، دانشور اور مؤرخ بھی ہیں۔ ہم آج کے پروگرام میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

گفتگو:

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب، آپ سے گفتگو کی خواہش ایک عرصۂ دراز سے تھی کیونکہ میرے خیال میں جن شخصیات کی قیامِ پاکستان سے قبل حصولِ پاکستان کے دوران دی جانے والی قربانیوں کی داستانیں آج بھی محفوظ ہیں، وہ میرے نزدیک تاریخ کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ زندہ و جاوید قوموں کا سب سے بیش قیمت ورثہ ان کا ماضی ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ جیسی تاریخ کی چشم دید گواہ شخصیات اس دل گیر اور اندوہناک ماجرے سے ہماری نوجوان نسل کو آگاہ کریں، تاکہ ہماری نئی نسل اپنی عظمتِ رفتہ کو یاد کر کے اپنے مستقبل کی راہیں روشن کر سکے۔

ہم یادوں کی روداد کا آغاز اس فضا سے کرتے ہیں جہاں پاکستان بننے کا خواب بُنا جا رہا تھا اور آپ اس ماحول میں پیدا ہوئے۔

جاوید اقبال: نعیم صاحب اصل میں بات یہ ہے کہ جہاں تک پاکستان کی تاریخ کا تعلق ہے تو کہہ لیجئے کہ میرے جیسے لوگوں کا شمار اُس نسل سے بھی اگلی نسل میں ہوتا ہے۔ اگر میں ان تاریخی جھروکوں سے بیشتر اپنی یادداشتوں کے سلسلے کا آغاز کروں تو میرا سنِ پیدائش 1924ء ہے۔ ہم لوگ اُس زمانے میں 116 میکلوڈ روڈ پر واقع گھر میں رہائش پذیر تھے جو آج کل آثارِ قدیمہ کی تحویل میں ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: یہ 1929ء کی بات ہے غالباً اس وقت میری عُمر پانچ یا چھ برس ہوگی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ایک جرمن فلسفہ دان حکومت کے خرچ پر ہمارے مہمان خانے میں ٹھہرے تھے۔ بلکہ اُنہوں نے اپنے تحریری بیان میں بھی پاکستان آمد کا سبب بنایا تھا۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: وہ ہائیڈل برگ میں علامہ اقبال کے دوست تھے۔ علامہ اقبال تو جرمن زبان سیکھ رہے تھے لیکن یہ علم جغرافیہ کے ماہر تھے۔ Heidelberg University کے طالب علم تھے۔ حضرت علامہ اور ان کی آپس میں دوستی ہوگئی۔

مجھے جہاں تک یاد ہے کہ جب 1929ء میں یہ لاہور آئے تھے تو علامہ صاحب نے ان سے گزارش کی کہ پاکستان کے چاروں صوبوں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کا نقشہ بھی بتائیں اور اس میں مسلمان اور ہندوؤں کی آبادی کا تناسب بھی بتائی۔ پس انہوں نے وہ نقشے بنائے اور اپنے نقشے میں تاریخی رنگ کے نقاط سے ہندو آبادی اور سبز رنگ کے نقاط سے مسلم آبادی دکھائی۔ علم جغرافیہ کے ماہر ہونے کے باعث ان نقشوں میں آبادی کا تناسب بھی بالکل صحیح واضح کیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں نے اپنے گھر میں یہ نقشے ادھر اُدھر بکھرے پڑے دیکھے تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: جب پاکستان کا خاکہ تیار ہو رہا تھا تو ایک اعتبار سے یہ میرا پاکستان سے پہلا تعارف تھا۔

نعیم طاہر: پاکستان بننے کا پہلا تصور یا خواب اور (Realistic Geographical Limits) حقیقی جغرافیائی حدود۔

جاوید اقبال: جی ہاں۔ کم از کم میرے لیے یہ بات تعجب کی ضرور تھی کہ یہ نقشے کیوں بن رہے ہیں یا بنائے جا رہے ہیں۔

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب، آپ تو اُس وقت تقریباً پانچ یا چھ برس کے ہونگے۔ ہاہاہا۔۔۔

جاوید اقبال: آپ کہہ لیجئے کہ پاکستان بننے کے حوالے سے یہ میری پہلی یادداشت ہے، جبکہ اس وقت پاکستان کے نام کا وجود بھی نہیں تھا۔ اُس وقت تو علامہ صاحب کے ذہن میں بھی غالباً مسلم ریاست کا تصور تھا یعنی شمال مغرب میں واقعہ جہاں مسلم اکثریتی صوبے ہیں۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: مقصودِ نظر ان نقشوں سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ آبادی کے لحاظ سے ان چار صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو اس اعتبار سے کیوں نہ یہ اہم نکتۂ نظر آگے جا کر پیش کیا جائے اور ان کی علیحدہ وفاقی جماعت بنے۔

بہرحال یہ 1929ء کی بات ہے اور اس وقت علیحدہ مسلم ریاست کا تصور بھی نہیں تھا۔ یہ تمام

Scanned with CamScanner

واقعات خطبہ الٰہ آباد سے پیشتر کے ہیں جب حضرت علامہ نے کوشش کی تھی کہ یہاں ایک مسلم سیاسی جماعت بنائی جائے۔ جن کا تعلق UPPER INDIA کے ساتھ ہو۔

نعیم طاہر: اچھا بالائی انڈیا۔

جاوید اقبال: جی ہاں۔ ایک زمانے میں سرسیّد کا بھی یہی نظریہ تھا۔ خطبہ الٰہ آباد سے قبل علامہ اقبال نے چاروں صوبوں کی اہم شخصیات کے نام ایک اپیل کی کہ آپ سب لاہور میں اکٹھے ہوں اور مستقبل قریب میں مسلمانوں کو جن مشکلات ومسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان معاملات پر کُچھ غور وفکر کریں۔

علامہ نے اس اپیل میں ایک فقرہ بہت دلچسپ تحریر کیا تھا۔ انہوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس بات کا علم خدائے کلیم کو ہے کہ ان چار صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت کیوں ہے اور ہم سمجھ بوجھ رکھنے والے آہستہ آہستہ اس مصلحت الٰہی کو سمجھ رہے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: لیکن اس میٹنگ کی نوبت نہیں آئی، کیونکہ 1929ء یا اس کے بعد کے سالوں میں گول میز کانفرنس کا چرچا ہونے لگا جس میں مسلمان اپنا نکتہ نظر پیش کریں گے۔

نعیم طاہر: مسلم لیگ کا قیام 1906ء میں عمل میں آیا۔ کیا اس مسئلے کو مسلم لیگ نے نہیں اُٹھایا؟

جاوید اقبال: قائداعظم کی تحریک خلافت میں ناکامی کے بعد کے دور میں تقریباً 1924 میں مسلم لیگ کی تحریک قائداعظم کی قیادت میں بحال ہوتی ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: قائداعظم 1936 میں لاہور تشریف لائے اور علامہ اقبال سے ملاقات بھی ہوگئی تھی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: یہ سب واقعات تو تقریباً 1936 کے ہیں۔ لیکن 1929 سے بیشتر ہماری سیاسی تاریخ میں ایک واقعہ بہت اہم ہے۔ کہ مسلم لیگ میں ایک اہم مسئلے پر منقسم ہوگئی کہ جداگانہ انتخابات (Separate Electorate) کے حق میں دست بردار ہوں یا نہ ہوں۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

جاوید اقبال: لیکن 1929ء میں مسلم لیگیوں کے درمیان پھر اتحاد ہوجاتا ہے۔ اور اکٹھے ہونے کے بعد جداگانہ انتخابات کا نظریہ کس طرح دوقومی نظریے (Two Nation Theory) کی بنیاد بنا۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

جاوید اقبال: اور کس طرح مسلمان اکثریت والے علاقوں میں دوقومی نظریے سے حق خودداریت کا مطالبہ پروان چڑھا۔ یہاں دوتین باتیں غور طلب ہیں کہ علامہ صاحب نے 1930ء کے خطبے میں کچھ دو معنی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ جیسا کہ:

I would like to see the Punjab, the Noth-West Frontier Province. Sindh and Balochistan amalgamated into a single state. Self Government with in the British Empire, or without the British Empire, the formation of a consolidated North-West Indian Muslim State appears to me to be the final destiny of the Muslims, at least of North-West India.

یعنی یہاں ''ریاست'' کا لفظ استعمال کیا۔ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا گیا۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: تو تصور یہ تھا کہ ہم پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ ہم ہندوستان کے حصے کر رہے ہیں تو علامہ نے انگریزی زبان میں Within or Without British Empire جیسے ذومعنی الفاظ استعمال کرکے الگ ریاست کے حصول کے تاثر کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب، آپ تو اس وقت بہت کم سن تھے۔

جاوید اقبال: جی ہاں۔

نعیم طاہر: آپ کے کھیلنے کودنے کی عُمر تھی۔ اُس وقت آپ کو اپنے اردگرد ہونے والے حالات وواقعات کی سنگینی کا احساس نہیں ہوگا؟

جاوید اقبال: یہ تو یقینی بات ہے۔ کہ اس وقت تو نہیں یہ احساس تو بہت بعد میں ہوا۔ مثلاً میرے بچپن کی جزوی یادداشت میں یہ واقعہ بھی بہت اہم ہے کہ 1936ء میں پہلی مرتبہ قائداعظم لاہور تشریف لائے۔ فلیٹیز ہوٹل (Faletti's Hotel) لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ فاطمہ جناح بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ قائداعظم نے ہمارے گھر چار بجے تشریف لانا تھا۔ اس زمانے میں میرا ایک مشغلہ تھا، کہ ہمارے گھر جو بھی مہمان آتا میں اُن سے آٹوگراف لیتا تھا۔ علامہ صاحب نے میری اس

Scanned with CamScanner

بات کو نہ کبھی سراہا اور نہ ہی کبھی بُرا منایا۔ لیکن اُس روز خاص مجھے صبح بُلوایا اور کہا کہ آج چار بجے ہمارے مہمان آرہے ہیں تم اپنی آٹوگراف والی کتاب لے آنا اور ان سے آٹوگراف لے لینا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: مجھے بہت تعجب ہوا۔

نعیم طاہر: کبھی آج تک تو کہا نہیں۔

جاوید اقبال: جی بالکل۔ آج تک تو کبھی کسی شخصیت کے لیے نہیں کہا کہ اِن سے آٹوگراف لینا ہے۔ خیر جب مجھے مہمانوں کی آمد کا علم ہوا تو میں وہاں چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ قائداعظم کے طور پر بھی نہیں جانتے تھے۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

جاوید اقبال: چونکہ یہ تو بڑا ابتدائی دور تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص نہایت نفیس کریم رنگ کا سِلک کا سوٹ، سفید قمیض، نیکٹائی (Nectie) اور سفید اور بھورا دو رنگ کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: سفید ساڑھی میں ملبوس فاطمہ جناح ایک علیحدہ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ قائداعظم میرے والد کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ میں نے آٹوگراف کی کتاب کھولی اور قائداعظم کے آگے کر دی۔ اُنہوں نے اپنی جیب سے قلم نکالا۔ میرے پاس تو قلم بھی نہیں تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہاہا۔

جاوید اقبال: انہوں نے اپنی جیب سے قلم نکال کر دستخط کیے اور نیچے تاریخ لکھ دی۔ قائداعظم نے دستخط کرتے ہوئے۔ میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور فرمایا کہ "Do you also write poetry?"
میں نے کہا: "No Sir"۔
تو اس کے بعد دوسرا سوال ٹھک کر کے آیا جیسے کہ ایک بڑا سمجھدار وکیل جرح (Cross Examine) کرتا ہے۔ جیسے تیر کمان سے چھوٹتا۔ Because the second question came immediately and tota lly unnerved me. تو دوسرا سوال پوچھا کہ Than What are you going to do when you grow up.

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہاہا۔

جاوید اقبال: اچھا اب اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تو میرے والد کی طرف چہرہ کر کے پوچھتے ہیں He does not answer.

نعیم طاہر: اچھاہاہاہاہا۔

جاوید اقبال: تو علامہ صاحب نے کہا: He won't answer. He is waiting for you to tell him what he is to do.

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ That was smart

جاوید اقبال: مجھے آج بھی علامہ صاحب کے یہ الفاظ یاد ہیں (ہنستے ہوئے)۔ He is waiting for you to tell him. what is he to do.
میں نے اس ملاقات پر یہ بات بھی محسوس کی کہ علامہ اقبال، قائداعظم کو کتنی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

نعیم طاہر: یقیناً۔

جاوید اقبال: یہ قائداعظم کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی جو آج بھی میرے ذہن میں ثبت ہے۔ آٹوگراف کی کتاب بھی میرے پاس آج تک محفوظ ہے اور غالباً اس پر 6 مئی 1936 کی تاریخ درج ہے۔ اُس روز علامہ صاحب سے ملاقات کرنے سے پہلے، قائداعظم پنجاب کے وزیراعلیٰ سر فضل حسین کے ہاں بھی گئے تھے۔ اگر آپ علامہ سے ان کی ملاقات کو اُس پس منظر میں دیکھیں تو سر فضل حسین کی ڈائری بھی شائع ہو چکی ہے۔ جس میں یہ عبارت مندرج ہے:

Muhammad Ali Jinnah came to see me today and I personally feel that there is no one who is behind him and therefore I didn't attach any importance to him.

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

جاوید اقبال: اگر آپ سر فضل حسین کی ڈائری پڑھیں تو اس میں یہ تحریر 6 مئی یا اس سے ایک روز قبل کی تاریخ میں درج ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ یہ تو بہت عمدہ بات ہے۔ کیا یہ ڈائری آج بھی دستیاب ہے؟

Scanned with CamScanner

جاوید اقبال: جی جی دستیاب ہے۔ یہ کتاب Diary and notes of Mian Fazl-i-Hussain کے نام سے ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان نے 1977ء میں شائع کیا۔ یہ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ جب میں حضرت علامہ کی سوانح عمری ''زندہ رُود'' لکھ رہا تھا اس وقت میں نے اس کتاب سے بھی استفادہ کیا تھا۔

نعیم طاہر: ''زندہ رُود'' میں نے پڑھی ہے۔

جاوید اقبال: جی اس کتاب میں بھی یہ واقعہ درج ہے۔

جب قائداعظم لاہور تشریف لائے تھے تو ان کی یہ کوشش تھی کہ پنجاب میں مسلم لیگ کو فروغ حاصل ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے علامہ صاحب سے سفارش کی کہ آپ صوبائی مسلم لیگ کے صدر بن جائیں۔ تو علامہ نے حامی بھر لی۔

نعیم طاہر: علامہ صاحب سے؟

جاوید اقبال: جی ہاں۔ علامہ صاحب اس وقت بیمار بھی تھے۔ انہوں نے اعتراض بھی کیا کہ میں علالت کے باعث شاید عملی طور پر کچھ کر نہ سکوں۔ کیونکہ علامہ صاحب فراش تھے۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: لیکن قائداعظم نے بہت اصرار کیا کہ آپ ہی بنیں گے تو علامہ نے اُن کی یہ پیش کش قبول کر لی اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر مقرر ہوئے۔ اب اتنے واقعات تو مجھے یاد نہیں۔

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب ابھی یہاں ذکر ہوا سوانح عُمری (Biography) کا۔ تو اس حوالے سے میں ذاتی طور پر خود اور اپنے دوستوں کی جانب سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جو سوانح عمری لکھی ہے ''اپنا گریبان چاک''۔ میں نے اس سے زیادہ دلچسپ سوانح عمری نہیں پڑھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ، آپ نے نہایت دیانت داری سے حقائق و واقعات کو بیان کیا ہے۔

جاوید اقبال: جی۔

نعیم طاہر: سچ بات اپنا ایک مقدم مقام رکھتی ہے۔ میں آپ کو مبارک باد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے بہت سے سوچنے والوں کی قیادت کرتے ہوئے نہ صرف سچ بولا بلکہ سچ بولنے کی ترغیب دی۔

جاوید اقبال: میں تو اس بات پر یہی رائے دوں گا کہ جھوٹ بولنا بہت آسان ہے لیکن سچ کبھی بھی پورا نہیں بولا جا

سکتا کیونکہ اس میں بہت ساری مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔

جس حد تک ممکن ہو سکا میں نے سچ بولا ہے لیکن میں یہ بات تسلیم نہیں کروں گا کہ مکمل سچ ہے۔

Not the whole truth.

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ ڈاکٹر صاحب ابھی تک گفتگو ہو رہی تھی لیکن، سُنا ہے آپ نے سُوئی کو بغیر خون بہائے جسم سے گزارنا بھی سیکھ لیا تھا؟

جاوید اقبال: جی جی جی۔

نعیم طاہر: وہ کیا منتر تھا؟

جاوید اقبال: وہ منتر مجھے ابھی تک یاد ہے۔

"سوئی بنا سلائی بنا دھرتی دااے قاصد، ناڑ دی سوئی پٹ دادھا گا تلے منتر فرے واہمیشہ دیکھا ہیر نار سنگھ یترے علم دا تماشہ۔"

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔

جاوید اقبال: ہیر نار سنگھ کون شخصیت ہے۔ ہاہاہاہا۔ یہ پنجابی کا منتر ہے۔

نعیم طاہر: اچھا ڈاکٹر صاحب اگر میں آپ کو سوئی پیش کروں تو کیا میرے جسم میں سے گُزار دیں گے؟ ہاہاہاہا۔۔۔

جاوید اقبال: جس طرح آپ حکم کریں۔ لیکن یہ ہڈی میں سے نہیں گزارنی۔

نعیم طاہر: ہڈی میں سے نہیں گزارنی؟

جاوید اقبال: جی۔ مثال کے طور پر ناک یا کان چھیدوانہ ہو تو بہت کم خون نکلے اور بغیر تکلیف کے یہ تجربہ بہت کامیاب رہتا ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ سوئی تو میرے پاس ہے لیکن میں ناک نہیں چھیدوانا چاہتا۔

جاوید اقبال: ہاہاہاہا۔۔۔

نعیم طاہر: اس لیے میرا خیال ہے کہ اس معاملے کو یہیں رہنے دیتے ہیں۔ اچھا ڈاکٹر صاحب، اب اس دور کی بات کرتے ہیں جب آپ جوانی کی منازل طے کر رہے تھے۔

جاوید اقبال: جی یہ زمانہ علامہ کی وفات کے بعد یعنی 1940ء سے آگے کا ہے۔ جب مسلم لیگ کی پاکستان کے حصول کے لیے ایک باقاعدہ تحریک بھی شروع ہو جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: جی ہاں۔ آپ نے اپنی کتاب میں اپنے اس عہد کے دوستوں اور درویشوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

جاوید اقبال: جی بالکل۔

نعیم طاہر: یہ درویش کون کون تھے؟

جاوید اقبال: ان بیچارے درویشوں میں اکثریت کیا، میں سمجھتا ہوں سبھی وفات پا چکے ہیں، ماسوائے ایک یا دو کے، جو اب تک حیات ہیں۔ ایک تو ان میں بیگم سلمٰی تصدق کے صاحبزادے جسٹس اسلم ریاض ہیں۔ جو جسٹس اور گورنر کے عہدے پر فائز رہے۔ آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: دوسرے ان کے ساتھ بہادر شیخ محمد تقی کے پوتے تھے۔ محمد زکی اور محمد شمیم۔

نعیم طاہر: اچھا۔ محمد زکی پبلک ریلیشنز میں بھی رہے؟

جاوید اقبال: جی بالکل۔ پبلک ریلیشنز میں بھی رہے۔ محمد زکی اور محمد شمیم وفات پا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر مسعود، میکلوڈ روڈ پر ہوا کرتے تھے۔ جو اب علامہ اقبال روڈ کے نام سے موسوم ہے، ان کے صاحبزادے الیاس مسعود تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: ان کے علاوہ دو اور شخصیات ہمارے ساتھ ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک شیخ خورشید جو بعد میں وزیر بھی بنے اور دوسرے ایم۔ بی۔ زمان جو کہ بہت اچھے وکیل بنے۔

نعیم طاہر: اچھا ٹھیک ہے۔

جاوید اقبال: پس، ایم بی زمان، شیخ خورشید، محمد زکی، محمد شمیم، اکرم اور اسلم ریاض، ہم سب نے مل کر سائیکلوسٹائل (CycloStyle) مشین کے ذریعے ایک "Voice of Islam" کے نام سے انگریزی زبان میں اخبار نکالا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہا۔

جاوید اقبال: یہ شاید 1944 یا 1945 بلکہ 1946 کا واقعہ ہے جب آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ وہ تمام اخبارات جو تحریک پاکستان یا قائداعظم کی حمایت میں تھے۔ بند کر دیے گئے تھے۔

ڈان اخبار کے داخلہ کی پنجاب میں ممانعت تھی۔ خضر حیات وزیر تھے۔ مسلم لیگ تحریک کی پاداش میں لوگ دھڑا دھڑ جیلوں میں بھرے جا رہے تھے۔ ڈان اخبار کے داخلے پر پابندی کے باعث کوئی

خبر عوام تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

اور بھی بہت سے طالب علموں نے سائیکلوسٹائل مشین گھر میں رکھی تھیں۔ ہمیں روزانہ کی بنیاد پر جو خبریں موصول ہوتیں۔ انہیں لکھ کر اور پھر چھاپ کے شہر کے مختلف حصوں میں تقسیم کرتے۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: میرے گھر سے ریلوے اسٹیشن بہت قریب تھا جو کہ اب اقبال میوزیم بن چکا تھا۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔ میں بھی وہیں قریب ہی رہائش پذیر ہوں۔

جاوید اقبال: رات کو لاہور سے دہلی جانے والی ریل گاڑی میں محمد شمیم یا محمد زکی دہلی جاتے تھے۔ اور یہ دہلی صبح پہنچتے تھے۔ صندوقوں میں بند کر کے اگلے روز صبح کی گاڑی سے وہ لاہور پہنچ جاتے تھے۔ ہمارے پاس اتنے پیسے تو ہوتے نہیں تھے۔ جس کے باعث انہیں تیسرے درجے میں سفر کرنا پڑتا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: یوں ایک روز کی تاخیر سے ڈان اخبار مل جاتا تھا۔ ایک حیرت انگیز بات یہ بھی ہے کہ ہمارے گھر کے سامنے ایک عمارت تھی جسے ملک بلڈنگ کہتے ہیں اور یہ عمارت آج بھی موجود ہے۔ اس میں CID کے آدمی رہتے ہیں۔ انہیں یہ بات معلوم تھی کہ ہمارے گھر سائیکلوسٹائل مشین ہے اور ڈان اخبار بھی آتا ہے لیکن انہوں نے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔

نعیم طاہر: اچھا وہ بھی دلی طور پر معین و معاون تھے۔

جاوید اقبال: جی وہ بھی ہماری حمایت میں تھے۔ جب خضر کی وزارت ٹوٹ گئی۔ یہ قصہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ تو یہ صاحب ہمارے گھر تشریف لائے اور با قاعدہ اعتراف کیا کہ ہمیں سب معلوم تھا لیکن ہم آپ کے ساتھ تھے۔

نعیم طاہر: تحریکیں تو ایسے ہی چلتی ہیں۔ اچھا ڈاکٹر صاحب، ایک بار پھر اگلے دور میں چلتے ہیں۔ ایک بات جو میں نے نوٹ کی کہ آپ نے قائداعظم کا لباس بڑی تفصیل سے بیان کی۔

جاوید اقبال: جی ہاں۔

نعیم طاہر: آپ کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ اچھے لباس کا بہت ذوق رکھتے ہیں۔ کیا اس سب آپ نے قائداعظم کے لباس، جوتے اور رنگ کا بغور جائزہ لیا؟

جاوید اقبال: آپ نے بڑی نکتہ سنج بات کی ہے۔ دراصل قائداعظم اس دور سے میری مثالی شخصیت تھے جب

Scanned with CamScanner

میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔

مثالی انسان کے لیے نطشے (Friedrich Nietzsche) نے Superman اور جانسن (Dirk. R. Johnson) نے Overman کی اصطلاح استعمال کی ہے، جو عام انسان سے بلند تر ہوتا ہے۔

نعیم طاہر: Overman.

جاوید اقبال: آزادی کی تحریک کے دوران میرے دو مضامین ڈان اخبار میں چھپے تھے۔ میں نے اس مضمون میں اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی کہ کس طرح قائداعظم کی شخصیت Superman یا Overman کے درجے پر فائز ہے جو کہ عام انسان سے بہت بلند ہے۔

نعیم طاہر: بلند شخصیت ہے۔

جاوید اقبال: اس مضمون میں Superman اور Overman کو توضیح بھی کر دی تھی۔ میں اس زمانے میں انگریزی ادب کا بھی طالب علم تھا اور نطشے کا بھی۔ یہ مضمون قائداعظم نے بہت پسند کیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: دوسرا مضمون Islam and Pakistan کے عنوان سے تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: میں نے اس مضمون میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا تھا۔ کہ پاکستان کا قیام روایتی یا رسمی (Conventional) اسلام کی بنیاد پر عمل میں نہیں لایا گیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: جی ہاں۔ میرا یہ مضمون بھی قائداعظم نے بہت پسند کیا لیکن اب دونوں مضامین میرے پاس نہیں ہیں، کیونکہ وہ ضائع ہو گئے۔ بہر حال ڈان اخبار میں سے مل سکتے ہیں اگر وہ محفوظ ہوا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: قائداعظم کے سیکرٹری نے ان مضامین کے متعلق مجھے خط لکھا تھا کہ قائداعظم نے آپ کے یہ دونوں مضامین پڑھے ہیں اور بہت پسند کیا۔ میں نے اس خیال کے بعد میں مزید تفصیل کے ساتھ بھی بیان کیا کہ علامہ اقبال تو صاحبِ فکر تھے جبکہ قائداعظم صاحبِ عمل تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: اور ہمیشہ سے میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ صاحبِ عمل کو صاحبِ فکر پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے قائداعظم ایسی مثالی شخصیت کے مالک تھے کہ ہر پاکستانی کو ان کا تتبع کرنا چاہیے۔ خواہ وہ لباس ہو، عادت ہو یا سوچ۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: میرے لیے تو وہی مثالی شخصیت ہیں۔ میرے انگریزی لباس یا دیسی لباس میں جو نفاست نظر آتی ہے اس کا موجب قائداعظم ہیں۔ میرے تصورات میں روشن خیالی کی وجہ بھی قائداعظم کی شخصیت ہے۔ میری ذات میں جو خامیاں ہیں وہ شاید قائداعظم کی خامیاں ہیں۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔ تو صاحبِ عمل شخصیت کے طور پر قائداعظم ہمیشہ آپ کے لیے مثالی رہے۔
اچھا ڈاکٹر صاحب اب گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہیں۔ پاکستان بن گیا، آپ غالباً انگلستان میں تھے۔

جاوید اقبال: نہیں۔ قیام پاکستان کے وقت میں یہیں تھا۔ بلکہ قائداعظم کی وفات کے موقع پر بھی کراچی میں ہی موجود تھا۔ میں وہاں بھی گیا جہاں قائداعظم کا جسم خاکی رکھا گیا تھا۔ میرے پاس مووی کیمرا بھی تھا۔ میں نے تصویریں بھی لینے کی کوشش کی لیکن پولیس نے وہیں پر ضائع کر دی۔ قائداعظم کے جنازے میں بھی شریک ہوا۔ اس کے بعد 1949ء میں انگلستان جاتا ہوں۔

نعیم طاہر: قائداعظم کا ایک روشن خیال اور اعتدال پسند معاشرے کی تشکیل، علامہ صاحب کا چشمۂ فکر اور پاکستان کے حصول میں نوجوانوں کا جو تصور پیش نظر تھا۔ کیا ہم اس طرزِ فکر پر چل سکے ہیں۔

جاوید اقبال: میرا تو ذاتی خیال یہی ہے کہ نہیں چل سکے۔۔۔

نعیم طاہر: نہیں چل سکے۔

جاوید اقبال: میں نے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا کہ میں صاحبِ فکر سے زیادہ صاحبِ عمل کو اہمیت دیتا ہوں۔ صاحبِ فکر نے تو ہمیں ایک تصور دیا۔ ان تصورات میں اقبال کا بنیادی تصور "خودی" کا ہے۔ گویا ہمارے ہاں خودی کے روایتی تصور کا مفہوم خودی کو مارنے کا ہے۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

جاوید اقبال: کہہ لیجئے کہ اسی سبب تقلید کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے، کہ ہم خودی کو مار مار کے جس طرح علامہ فرماتے ہیں:

Scanned with CamScanner

"اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری"

ہم کشتہ بن چکے ہیں۔ ہمیں ان تین قوتوں نے کشتہ بنا دیا ہے۔ مولویوں، سلطانی کے مطلق العنانیت اور برسوں کی پیری مُریدی نے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: ہمارا معاشرہ تو تباہ ہو چکا تھا۔ آج کے دور میں جدید تصورات کے ساتھ اس کا احیا بھی لازم امر تھا۔ دیکھیے ہم نے دارالسلام اور دارالحرب کے مسئلے پر، جہاد اور ہجرت کو مسئلوں وغیرہ پر جنگیں لڑیں ہیں۔ شکست بھی کھاتے رہے ہیں۔ خواہ وہابیوں کی تحریک ہو یا خلافت کی تحریک، لیکن حصولِ پاکستان کے لیے قائم کردہ مسلم لیگ تحریک ایک جدید تحریک تھی۔ اس نے حقِ خودارادیت کا نظریہ پیش کیا۔ اسلام کا روشن ترقی پسند تصور تھا۔ ہم نے ہندوستان یا بھارت سے علیٰحدگی دو قومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کی۔ مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں ہیں جن کے اپنے اپنے جداگانہ مذاہب، ثقافتیں اور رسوم ورواج ہیں۔ ایک آزاد وخودمختار مسلم ریاست کا تصور پیش کیا گیا جو نظریہ پاکستان کا عکاس تھا۔ اس کا تعلق مذہب سے اُس طرح نہیں جس طرح یہاں غلط طور پر سمجھا گیا۔

نعیم طاہر: دُرست۔

جاوید اقبال: ہم نے لا الہ الا اللہ کے تعبیر یہ تو نہیں کی تھی کہ بریلوی، دیوبندی، شیعہ یا سُنّی ہے۔ انہوں نے اسلام کو کئی خانوں میں بانٹ دیا ہوا ہے، یہ کس قسم کا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ بریلوی، دیوبندی، شیعہ یا سُنّی، دارالحرب اور دارالسلام، جہاد اور ہجرت کا اس تحریک سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس تحریک کا تعلق تو قومی آزادی، خودمختار مسلم ریاست، قومی تشخص اور خودارادیت جیسے جدید تصورات کے ساتھ تھا۔ ہم نے ان جدید تصورات کے ساتھ اپنے عقیدے کو منسلک کر لیا۔

اب وہ طریقِ فکر اور اندازِ خیال جو ہمیں قائداعظم نے دیا اور علامہ اقبال کے ہاں بھی سوچ کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ جب قائداعظم نے یہ ارشاد فرمایا تھا:

You will sees to be muslims and you will sees to be hindus, not in the religious sense, but as equal citizens of a state.

نعیم طاہر: بالکل صحیح۔

جاوید اقبال: اس کے مقابلے میں ہمیں علامہ اقبال پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ کہ Islam stand for spiritual Democracy. یہ روحانی جمہوریت کیا ہے؟ علامہ اقبال جنوبی ایشیا کی پہلی مسلم شخصیت ہیں جنھوں نے اسلام کے ساتھ منسلک کی۔ اقبال نے یہ اصطلاح کہاں سے لی۔ اُن کی روحانی جمہوریت سے کیا مُراد ہے۔ کیا ان کی یہی مُراد ہے کہ اسلام کا مطلب روحانی جمہوریت ہے، جس میں غیر مسلم شریک نہ کیے جائیں۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ پھر تو......

جاوید اقبال: لیکن اقبال نے تو یہ نہیں کہا کہ روحانی جمہوریت صرف مسلمان فرقوں کے لیے وقف ہے اور اس میں غیر مسلم نہیں آتے۔

نعیم طاہر: درست۔

جاوید اقبال: اسلام کی توجیہہ بحیثیت روحانی جمہوریت آج تک کسی اسلامی مفکر نے پہلے نہیں کی۔ وہ مسلم وغیر مسلم میں ہمیشہ تمیز کرتے رہے اور اسی فرق کو اسلام وقرآن کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ جبکہ اقبال نے قرآن حکیم سے جمہوری نظام کے خدوخال اخذ کیے۔ اقبال کے خیال میں روحانی جمہوریت کا مطلب انسانی مساوات کے اسلامی اصولوں پر مبنی معاشی عدل وانصاف کا عوامی جمہوری نظام ہے اور روحانی جمہوریت کا قیام اور فروغ دین کا حقیقی مقصود ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

جاوید اقبال: ہم اپنی اردگرد کی تہذیب کے اعمال وافعال کو قبول کر سکتے ہیں لیکن ان کو اپنے طور طریق سے عمل میں لائیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس طرزِ عمل میں کتنی جدت ہے اور کتنا روایتی ہے۔

نعیم طاہر: کسی نہ کسی موقع پر دوسروں کے ساتھ تعامل تو کرنا پڑے گا۔

جاوید اقبال: ضروری ہے۔

نعیم طاہر: اس موجودہ زندگی میں روابط کے بھی کوئی اصول وضوابط وضع ہونا چاہیے۔ جبکہ روحانی جمہوریت کے اس روشن تصور کے گرد ابہام کی دھند پھیلا دی گئی۔

جاوید اقبال: میں نے اپنے لیکچرز میں بھی کہا ہے کہ حضرت علامہ نے اپنے خطبات میں روحانی جمہوریت (Spiritual Democracy) کی اصطلاح کے درست مفہوم کو واضح کیا ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

Scanned with CamScanner

جاوید اقبال: پاکستان کو سیکولر بنانے کا ایک متنازعہ بیان قائداعظم سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ سیکولرزم کا تو مسئلہ ہی ہمارے ہاں نہیں آتا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: اگر سیکولرزم سے مراد مذہبی آزادی ہے تو کیا اسلام مذہبی آزادی کے خلاف ہے۔ سیکولرزم تو اسلام کا حصہ ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

جاوید اقبال: آپ یہ دیکھیں کہ مغرب میں سیکولرزم کی ایک علیٰحدہ تاریخ ہے۔ اُس تاریخ کو اپنے معاشرے پر لاگو نہ کیجئے۔ مغرب میں سیکولرزم کی اصطلاح اس طرح وجود میں آئی کہ اس زمانے میں چرچ، بالخصوص کیتھولک چرچ (Catholic Church)، حاکمیت بھی اس کی تھی، بدعنوان ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے ہاں اصلاحِ دین (Reformation) کی تحریک چلی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: Reformation سے کیا مراد ہے؟ اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ جو موجودہ مذہبی اور روحانی احکامات ہیں۔ ان میں اصلاحات کی جائیں۔ چونکہ چرچ اخلاقی طور پر تباہ ہوگئے تھے۔ اس لیے اصلاح عمل کی تحریک نے مذہب اور ریاست کو علیٰحدہ کر دیا۔ اس کو مذہب والوں نے لادینیت کا نام دیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ مذہب والوں نے اس کی یہ تعبیر کی۔

جاوید اقبال: مذہب والوں نے اس کا مفہوم کچھ یوں پیش کیا کہ:

Secularism actually implies for Profanity

اس پر اقبال نے ایک لیکچر دیا:

"The Reconstruction of Religious thought in Islam" میں بڑا دلچسپ نقطہ پیش کرتے ہیں۔

کہ مابعدالطبیعیات (MetaPhysics) کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ مادی یا سیکولر دنیا جس طرح نظر آتی ہے وہ حقیقت میں نہیں ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: اگر آپ اس میز کا گہرا تجزیاتی مطالعہ کرتے چلے جائیں تو یہ غائب ہو جائے گا۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ روحانیت (Spiritualism) کی بنیاد پر ہی مادیت (Materialism) بھی قائم ہے۔

نعیم طاہر: بالکل صحیح۔

جاوید اقبال: تو اس حساب سے سیکولرسٹ (Secularist) کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یہ دُنیا ناپاک نہیں ہے بلکہ اس میں ہر چیز مقدس مقام رکھتی ہے۔ اس دُنیا کی بنیاد روحانیت پر قائم ہے۔ اگر آپ مادہ کو تحلیل یا کاٹتے چلے جائیں تو وہ توانائی میں تبدیل ہو جائے گی۔

Bertrand Russell تو کہتا ہے کہ:

Energy is not the proper world to say it.

ہم نہیں جانتے کہ یہ سب کہاں غائب ہو جاتا ہے اور کہاں سے آتا ہے۔ اب اگر ہر چیز کی بنیاد ہی غیر مرئی ہے تو اس میں لادینیت، مذہب اور سیکولرزم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ ایک ہے۔

نعیم طاہر: ایک خیال یہ بھی ہے سیکولرزم کا تصور جدید اسلام کے تصور سے علیٰحدہ نہیں ہے۔

جاوید اقبال: اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس بحث کو چھیڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نعیم طاہر: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جاوید اقبال: کیونکہ اسلام چرچ نہیں ہے۔ یہ تو چرچ کی بنیاد کی ضرورت ہے کہ جسم و روح کے درمیان مابعدالطبیعیاتی تقسیم ہو۔ یہ بات اسی صورت میں ممکن ہے کہ اگر ہم رُوح کو چرچ کے ساتھ منسلک کر دیں اور جسم کو چرچ سے علیٰحدہ کر دیں۔ اسلام میں تو چرچ ہے ہی نہیں اس لیے اسلام میں لادینیت کا تصور ہی نہیں ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ڈاکٹر صاحب، ایک جدید تصور کی بنیاد پر اس جدید ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا؟

جاوید اقبال: قومی ریاست۔۔۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔ مذہبی ریاست نہیں بلکہ قومی ریاست۔ تو اس کے اندر یہ سیاسی خلا کیسے پیدا ہوگیا کہ کچھ لوگوں نے ان نظریات کی حمایت نہ کی اور اس پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بنیادی تصورات میں ترمیم و آمیزش کرنے لگے۔ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

جاوید اقبال: میں عرض کرتا ہوں۔ میں نے خود اس موضوع پر تحقیق کی ہے۔ ابھی حالیہ دنوں میں اس موضوع پر

Scanned with CamScanner

میری ایک کتاب .Islam and Pakistan's identity کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: اس میں یہ بحث ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: اس کتاب میں، میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے کہ یہ جو تبدیلیاں ہوئیں۔ ایک تو وہ زمانہ تھا جب علماء حضرات تحریک پاکستان کے خلاف تھے۔ تاہم ان میں وہ صاحب عالم متقی ہیں جنہوں نے قائداعظم کا ساتھ دیا۔ بعدازاں جس وقت پاکستان بن چکا۔ بالخصوص جب قراردادِ مقصد پاس ہو رہی تھی تو اس وقت بڑی اہاں اہی ہوئی۔ قائداعظم کی وفات کے بعد وہ پاس ہوئی۔ تو اس پر بہت سارے لوگوں نے اختلاف کیا اور اس پر جو بھی بحث مباحثہ ہوا وہ قلم بند کیا گیا۔ اس کو آپ پڑھ سکتے ہیں۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

جاوید اقبال: قائداعظم کے زمانے میں ہندو بھی وفاقی حکومت کے وزیر رہے۔ قادیانی بھی ظفر اللہ خان جیسی شخصیت۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا بہت اہم کردار ہے۔ ان میں کسی قسم کا امتیاز نہ تھا۔ لیکن بعد میں جب یہ دور بدلتا گیا۔ ہم نے اقتدار میں رہنے کے لیے سیاسی مفاہمت ان عناصر کی بنیاد پر کرتے رہے۔ آپ کو معلوم ہے جب احمدیوں کے خلاف پہلی تحریک شروع ہوئی تھی تو پہلا مارشل لاء لگا ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: ہمارے پہلے گورنر جنرل اور وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو گرانے کے لیے یہ تحریک پنجاب سے چلائی گئی۔ پس ہم نے سیاسی طور پر ان عناصر کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب اس دور سے یا شاید کچھ پہلے سے مشرقی پاکستان جو، اب بنگلہ دیش ہے، اُن میں اور یہاں کی سوچ کے رُخ میں زیادہ تفاوت و دُوری جبھی سے پیدا ہونی شروع ہوئی۔

جاوید اقبال: ایک اعتبار سے، چونکہ آئین تشکیل دینے میں بھی چوہدری محمد علی نے اتنا وقت صَرف کیا۔ اُن کو برابری کے حقوق پر بنگالیوں کو منوانا تھا جو کہ تعداد میں بہت زیادہ تھی۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: ہلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اصولاً یہ غلط بات تھی۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: کیونکہ اگر آپ واقعی اسلام کی بنیاد پر یا مسلم قومیت کے تصور پر ایک ملک وجود میں لا رہے ہیں تو جن کی اکثریت ہے اُن کو اپنا حق لینے دیں۔ یا تو اُس وقت ہی یہ تصور عام کر دیتے کہ ایک قوم اور دو ریاستیں (One nation two states)۔

نعیم طاہر: ہاں وہ تو ٹھیک تھا۔

جاوید اقبال: اب محمود علی بھی یہی تصور پیش کرتے ہیں کہ بنگلہ دیش کے ساتھ تجارت کرو، آمد و رفت کرو لیکن دونوں ملکوں کے درمیان ویزے کا سلسلہ ختم کرو تا کہ اس کا تصور یہ ہو کہ ہم ایک قوم ہیں لیکن دو ریاستیں۔ .we are one nation but two states

نعیم طاہر: بالکل صحیح۔

جاوید اقبال: یا تو نظریہ اس وقت نافذ کر دیتے یا پھر ان کی اکثریت کو تسلیم کرتے۔ یہ مغربی پاکستان نہیں کیا جبھی تو وہ سارے اختلافات پیدا ہوئے۔

نعیم طاہر: تنازعات بڑھتا چلا گیا۔

جاوید اقبال: جی تنازعہ بڑھتا چلا گیا۔۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ڈاکٹر صاحب، میرے مشرقی پاکستان کے دوستوں کے خیال میں دونوں ممالک میں اختلاف کے آغاز کی بنیادی وجہ قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کو ڈھاکہ میں کی جانے والی تقریر ہے، جس میں وہ اُردو کو قومی زبان قرار دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اس تقریر نے دونوں ملکوں کے درمیان نفرت کا بیج بو دیا۔

جاوید اقبال: نہیں نہیں، میں نہیں سمجھتا۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اصولی طور پر قائداعظم جس مقام پر فائز تھے اور اُس وقت جو صورت حال تھی۔ اس کے مطابق یہ بیان درست تھا۔

نعیم طاہر: جی۔

جاوید اقبال: اردو پاکستان کے کسی خطے کی زبان نہیں ہے۔ نہ پنجاب، نہ سندھ، نہ بلوچستان، نہ سرحد۔ اُردو زبان کی تحریک پاکستان میں بڑی خدمات ہیں۔ اُردو دُنیا کی واحد مسلم زبان ہے جس نے ایک ملک تخلیق کر دیا۔ اور اُس ملک کی قومی زبان تصور کی گئی جو کسی خطے کی زبان نہیں ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جاوید اقبال: عمان میں ایک سیمینار ''اسلام کی ترویج میں مسلم زبانوں کی خدمات'' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ جس

Scanned with
CamScanner

میں عربی، ترکی، فارسی دان اور اُردو والوں نے بھی شرکت کی۔ میں اور حکیم سعید مرحوم صرف دو شخصیات تھیں جو اُردو زبان کی اہمیت کے حوالے سے پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ حکیم صاحب نے تو اس موضوع پر تقریر تو نہیں کی تھی، لیکن میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ جو خدمات اُردو نے دی ہیں۔ وہ عربی فارسی، ترکی یا کسی اور مسلم زبان نے نہیں دیں۔

یہ بتایئے کہ کس زبان نے ایک ملک تخلیق کیا۔ عربی کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اسلامی ریاست یا رسول اللہ کی ایک سلطنت یا حکومت قائم کی۔ مگر ہم نے تو ایک ریاست بنا دی جس کا پہلے وجود ہی نہیں تھا۔

نعیم طاہر: تو قائداعظم کا یہ نقطۂ نظر درست تھا۔

جاوید اقبال: جی بالکل ان کا موّقف صحیح تھا۔ Acknowledgement of Urdu as a language of muslim culture.

نعیم طاہر: میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی اس کتاب میں سے ''پیش لفظ'' کا ایک چھوٹا سا حصّہ پڑھ دیں۔

جاوید اقبال: علامہ اقبال کے فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردِعمل مختلف رہا ہے۔ بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے بُرا نہیں منایا کیونکہ مجھے علم ہی نہیں تھا وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ جوان ہوا تو تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔ یہ میرے لیے پدرم سلطان بود کی بنا پر فخر کا مقام تھا۔ زندگی میں اچھا بُرا اپنا مقام پیدا کیا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو مجھے بہت بُرا لگا۔ یہ میری انا کی نشو ونما میں مُداخلت تھی۔ اب بوڑھا ہو چکا ہوں تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے میرے باپ کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا اور ہمیشہ چھوٹا سا بچہ ہی سمجھ لیا۔ یعنی تناور درخت کے سائے تلے ایک ننھا سا پودا پروان چڑھتا ہے۔ وہ دراز قد ہو جائے، اپنی صورت نکال لے، تب بھی پودا ہی رہتا ہے اور بڑے درخت کے حوالے سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ بہر حال میں نے کئی حیلوں سے ایک بڑے درخت سے نکل کر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تگ ودو کے اس عالم میں کیا میں اُس سائے سے نکل کر اپنا سایہ بنا سکا۔ میں کس حد تک کامیاب ہوا اور کس حد تک ناکام، فقط یہی میری داستان حیات ہیں۔

اختتامیہ:

ناظرین، میں اپنی اور اپنے تمام کارکن ساتھیوں کی جانب سے اور آپ کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی گونا گوں مصروفیات میں سے کچھ وقت ہمارے لیے نکالا۔ ڈاکٹر صاحب سے ابھی بہت سے مختلف اہم امور پر بات ہونا باقی ہے لیکن آج کی نشست یہیں تک محدود رکھتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کا ان سے زیادہ معتبر گواہ تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال جیسی شخصیات کی گواہی آپ اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے بہت معتبر ہے۔ ڈاکٹر صاحب سلامت رہیں اور با عافیت رہیں۔

بہت بہت شکریہ۔۔۔

نعیم طاہر

☆☆☆

جہانگیر خان

ابتدائیہ:

پاکستان نے کھیلوں کی تاریخ میں جو غیر معمولی فتوحات حاصل کی ہیں اِن کی فہرست نہ صرف طویل ہے بلکہ چند الفاظ میں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ یہ فیصلہ کرنا بھی مُشکل کام ہے کہ کس فتح یا یادگار لمحے کو نمایاں جگہ دی جائے اور کسے نہیں، کیونکہ ہر فتح اپنے طور پر اہم ہے۔ دُنیا کے نقشے پر نئی ریاست کا درجہ حاصل کرنے کے بعد کھیلوں کے عوض پاکستان کو بہت سے اعزازات حاصل ہوئے۔ اگر یوں کہا جائے کہ شاید کھیل ہی واحد ایسی چیز ہے جس پر پوری پاکستانی قوم متحّد دِکھائی دیتی ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔

کھیلوں نے ہمیشہ پاکستان کو پہچان دی اور پاکستانی کھلاڑیوں نے بھی دُنیا بھر میں قومی پرچم ہمیشہ بُلند رکھا۔ 1951ء میں برٹش اوپن اسکواش (British Open Squash Championship) میں فتح سے لے کر اسنوکر کی عالمی چیمپئن شِپ (World Snooker Championship) میں پاکستان کی فتح اور روم اولمپکس (Summer Rome Olympics) میں ہاکی ٹیم کے سونے کے تمغے سے لے کر اوول (OVAL) کے میدان میں سرفراز احمد کی قیادت میں چیمپئنز ٹرافی کے فائنل میں ہندوستان کو شکست دینے تک کھلاڑی ملک کا پرچم سربلند کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

یوں تو مُلک و قوم کا سر فخر سے بُلند کرنے والے کھلاڑیوں کا شہر پشاور اور ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے

اُن سات چیمپئنز کا ہے۔ جنہوں نے پچاس برس تک اسکواش کی دُنیا پر راج کیا، اور دُنیا بھر سے بے شمار کامیابیاں سمیٹ کر پاکستان کا نام پوری دُنیا میں روشن کیا۔

ان سات اسکواش چیمپئنز میں سے ایک معروف نام جہانگیر خان کا بھی ہے۔

ذرا سوچیے اگر کسی بچے کے بارے میں اس کے والدین کو یہ معلوم ہو کہ وہ ہرنیا کی بیماری میں مبتلا ہے اور اسے دو مرتبہ آپریشن کے مرحلے سے گزرنا ہو گا تو کیا وہ اپنے بچے کو اسکواش جیسا سخت کھیل کھیلنے کی اجازت دیں گے؟ یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ ایک باپ اپنے بڑے بیٹے طورسم خان کو کھیلنے کے دوران زندگی کی بازی ہارتا ہو ادیکھ لے تو کیا وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو کھیلنے کی اجازت دے گا؟

سکواش کے عظیم کھلاڑی جہانگیر خان کو اپنی ابتدائی زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ دیکھنے پڑے۔ بارہ سال کی عمر تک پہنچنے تک ان کے دو ہرنیا کے آپریشن ہو چکے تھے لیکن سب سے بڑا دھچکا بڑے بھائی طورسم خان کی موت تھی جس نے ان کی دُنیا بدل دی۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ کب کا اپنے خوابوں کو سمیٹ کر بیٹھ جاتا لیکن جہانگیر خان کے مضبوط ارادوں نے انہیں سکواش کی تاریخ کا سب سے کامیاب کھلاڑی بنا ڈالا۔ میں اپنے آج کے اس پروگرام میں مسلسل دس مرتبہ برٹش اوپن سکواش چیمپئن شپ جیتنے کا اعزاز حاصل کرنے والے جہانگیر خان کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

گفتگو:

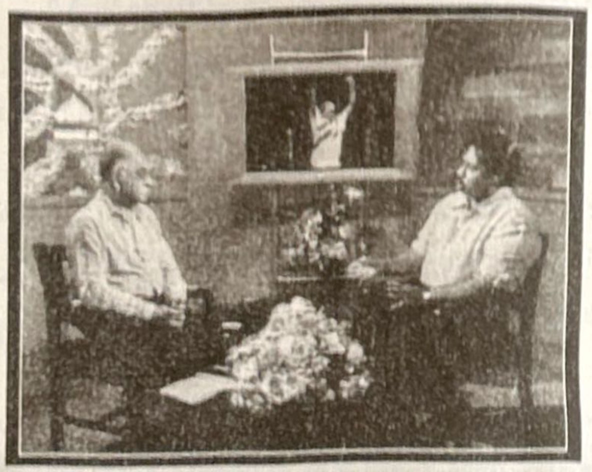

جہانگیر خان: بہت بہت شکریہ۔

نعیم طاہر: جہانگیر آپ کے والد روشن خان نے آپ کو کم سنی میں ریکیٹ کی لمبائی کاٹ کر کیوں دیا؟

جہانگیر خان: جیسا کہ آپ نے ذکر کیا کہ میں جسمانی طور پر صحت مند نہیں تھا۔ میرے والد میری صحت کے بارے میں بہت فکر مند تھے۔ میرے والد روشن خان چونکہ خود عالمی چیمپئن رہ چکے تھے اور میرے بڑے بھائی طورسم خان بھی انٹرنیشنل کھلاڑی تھے، میرے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ میں خود کو اس کھیل سے دُور رکھتا۔ جب میں آٹھ برس کا تھا تو میرے والد نے مجھے سکواش ریکیٹ دیا جس کی لمبائی کاٹ دی۔

خاص طور پر میں اپنے والد صاحب کی تصویریں اور اخباری تراشے جمع کرتا تھا اور اِن میں اپنا عکس دیکھتا تھا۔

نعیم طاہر: اُس وقت تک آپ کے خاندان میں سے کون کون سکوائش کی دُنیا پر طویل حکمرانی کر چکا تھا۔

جہانگیر خان: سب سے پہلے ہاشم خان نے 1951ء میں برطانوی اوپن سکواش چیمپئن شپ جیتنے کا اعزاز حاصل کیا۔ پھر میرے والد روشن خان، اعظم خان اور محب اللہ سینئر نے یہ اعزاز حاصل کیا۔ یہ چاروں کھلاڑی 1950ء سے 1963ء تک دُنیا بھر سے سکواش کے فاتح عالم رہے۔

پھر کچھ توقف کے بعد 1970ء سے 1980ء کے دوران مہب اللہ خان، گوگی علاؤ الدین، قمر الزمان، ہدایت جان، طورسم خان اور رحمت خان جیسے شاندار کھلاڑی ہیں۔ اس کے بعد زمانہ ہمارا ہے۔

نعیم طاہر: ہم بات کا سلسلہ ریکیٹ سے ہی آگے بڑھاتے ہیں کہ آپ کے والد نے آپ کو کھلونا سمجھ کر ریکیٹ دیا تا کہ آپ کا دل بہلتا رہے۔

جہانگیر خان: لیکن میں نے سنجیدگی سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے گھر کی سادہ دیوار پر سکواش کھیل کر قواعد کے مطابق ٹن بورڈ (Tin Board)، سروس لائن (Service Line)، آؤٹ لائن (Outline) وغیرہ کی باقاعدہ نشان دہی بھی کر رکھی تھی۔ یوں کہیے کہ میرے شب و روز اس شوق کی نذر تھے۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ اتنا شوق تھا۔

جہانگیر خان: شوق تو بہت تھا۔ لیکن میری جسمانی حالت کے باعث مجھے کلب جانے کی اجازت نہ تھی۔ میرا پہلا آپریشن پانچ برس کی عُمر میں کلب جانے کی خواہش میں ہوا۔ میں نے دس برس کی عُمر میں کلب جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن ڈاکٹرز میرے والد صاحب کو کہہ چکے تھے کہ میری جسمانی حالت ایسی نہیں کہ میں کبھی بھی سنجیدہ قسم کی سکواش کھیل سکوں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: یہ کلب آج کراچی میں روشن خان اور جہانگیر کے نام سے منسوب ہے جبکہ اس وقت Fleet Squash Club Karachi کے نام سے قائم تھا۔

نعیم طاہر: اگر آپ کے والد صاحب ڈاکٹر کی تجویز پر عمل کرتے تو آج، آپ سکواش کے افق پر ایک روشن ستارے کی مانند نہ جگمگاتے۔

جہانگیر خان: شروع میں، میرے والد صاحب نے بہت کوشش کی کہ میری تمام تر توجہ پڑھائی کی طرف مائل رہے۔ اور میں سکواش میں بالکل دلچسپی نہ لوں۔

نعیم طاہر: تو کیا آپ نے فرمانبرداری سے ان کے اس حُکم کی تعمیل کی؟

جہانگیر خان: نہیں۔

نعیم طاہر: آپ نے کھیل جاری رکھا۔

جہانگیر خان: چُھپ چُھپ کر گھر میں کھیلتا رہا۔

نعیم طاہر: کِدھر جا کر کھیلتے تھے۔ جب گیند دیوار سے ٹکراتی ہے تو آواز تو آتی ہوگی۔

جہانگیر خان: میں گھر کے صحن میں یا گلی میں جہاں سادہ دیوار ملتی تھی۔ کھیلتا رہا۔ اکثر اپنے دوستوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ بھی کھیلتا تھا۔ لیکن کلب میں کھیلنے کا ایک منفرد انداز ہے۔ میرے خاندان کے بہت سے لوگ کلب جاتے تھے، جب میں ان کے دلچسپ قصے سنتا تو میرا دل اور بے قرار ہو جاتا کہ میں بھی کلب میں انہی کی طرح کھیلوں۔

جب میرے سکول کی گرمیوں کی چُھٹیاں ہوتیں تو میں نے اپنے بھائی طورسم سے کہا کہ مجھے بھی والد صاحب سے کلب جانے کی اجازت لے دیں۔ میرے والد صاحب نے اس شرط پر اجازت دی کہ وہاں جا کر کھیلوں گا نہیں، صرف کھیلتے ہوئے دیکھوں۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

جہانگیر خان: آخر کار اجازت مل ہی گئی۔ میں کلب کے ارکان کو کھیلتے ہوئے دیکھتا تھا مجھے آج بھی یاد ہے کہ مرکزی دروازے کے ساتھ ہی سادہ دیوار تھی۔ مجھے اس بات کی بھی اجازت تھی کہ میں گھر کی طرز پر یہاں کھیلتا رہوں لیکن کورٹ میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ جیسے ہی کلب کے اراکین کھیل کے دوران کُچھ دیر آرام کرتے تو میں موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوراً کورٹ میں جا کر ان کی گیند سے کھیلنا شروع کر دیتا۔ آہستہ آہستہ کلب کے اراکین کے ساتھ بھی کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار میرے والد نے مجھے کھیلتا ہوا دیکھ لیا تو وہ بولے کہ یہ اچھا خاصہ کھیل رہا ہے اب اس پر پابندی لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن وہ میرا خیال بھی ضرور رکھتے تھے کہ کہیں مجھے درد تو نہیں ہو رہا۔ کیونکہ میری جسمانی صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں زیادہ بھاگ دوڑ کروں۔ اگر کبھی ایسا ہو جاتا تو مجھے رات میں کافی زیادہ تکلیف ہوتی۔

نعیم طاہر: دُنیا میں دو بڑے کھلاڑی ہیں جنہوں نے ناقابلِ شکست ریکارڈ بنایا۔ سکواش میں آپ کا نام سر فہرست ہے اور کرکٹ میں DON BRADMAN نے 99.94 اوسط کا عالمی ریکارڈ بنایا۔ آپ دونوں کھلاڑی دیوار کے ساتھ مشق کرتے تھے۔

جہانگیر خان: میرے خیال میں ان غیر معمولی کاوشوں سے ہماری صلاحیتوں میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ دیوار گیند

کی سمت کا درست تعین کرنے میں بھی مدد دیتی ہے۔

نعیم طاہر: دیوار گیند سے ٹکرا کر ہر صورت واپس آتی ہے تو اس سے آپ ہر لمحہ چوکس رہتے ہیں۔

جہانگیر خان: جی بالکل اور پھر ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کتنی طاقت سے گیند کو دیوار پر مار رہے ہیں اور گیند کا دیوار سے ٹکرانے کے بعد کیا ردِعمل ہوگا اور یہی بنیادی باتیں ہمیں گیند کی صحیح سمت کا تعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔

میرے والد صاحب نے مجھے پھٹی ہوئی گیند دی تھی۔ جس کو میں ٹیپ لگا کر کھیلتا تھا۔ اب وہ ٹیپ بھی کتنی دیرپا ہو سکتی تھی۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

جہانگیر خان: تھوڑی دیر تو گیند صحیح اچھلتی (BOUNCE) لیکن پھر ناہموار ہو جاتی۔ کبھی ہموار اور کبھی ناہموار اچھلتی تھی۔ جیسے ٹوٹے پھوٹے ریکیٹ سے کھیلیں تو اس کی گرفت اور ہمارے توازن میں نمایاں فرق ہے۔ اس کے باوجود ہمیں محتاط طریقے سے کھیلنا ہوتا ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

جہانگیر خان: یہی غیر معمولی اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں ہمارے اندر ایک خاص قسم کی مہارت پیدا کرتی ہیں اور اس بات کا اندازہ ہمیں مستقبل میں ہوتا ہے۔

نعیم طاہر: اپنے والد صاحب کی اجازت کے بعد آپ نے باقاعدہ اس کھیل کی تربیت لینا شروع کر دی۔

جہانگیر خان: میں نے پہلی بار تیرہ برس کی عُمر میں کراچی میں 19 برس سے کم عُمری کے جونیئر ٹورنامنٹ میں حصّہ لیا۔ میں نے اپنی عمر اور قد میں بڑے لڑکوں کو شکست دی اور سیمی فائنل میں پہنچ گیا۔ سب لوگ میری اس فتح سے حیران تھے۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ میرے بڑے بھائی طورسم خان بین الاقوامی سطح پر کھیل رہے تھے۔ اُن دنوں وہ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ میں نے بھائی سے کہا کہ مجھے ایسی تجاویز دیں جو اچھا کھلاڑی بنانے میں معاون ثابت ہوں۔ اُنہوں نے مجھے چند تجاویز دیں کہ جن کو اپنانے سے میرے کھیل میں نمایاں فرق پڑ گیا۔

نعیم طاہر: کیا ہدایات تھیں ہمیں بھی بتائیں شاید کل کا کوئی بڑا کھلاڑی آپ کی گفتگو سُن رہا ہو۔

جہانگیر خان: اُنہوں نے مجھے زیادہ سے زیادہ مشق کرنے کی خاص تاکید کی کہ گیند کو مارنے کی صلاحیت بہتر

بنانے کے لیے گیند کو دیوار کے خلاف بار بار پھینکو۔ اوپر اور نیچے کی لکیروں کے مابین حد کا احترام کرتے ہوئے دیوار پر مخصوص نکات مارنے کی کوشش کریں۔ گنتی بھی کرتے رہو اور بہتر سے بہتر کرتے جاؤ۔ جیسے اگر سکور پانچ ہے پھر دس پہ لاؤ اور سو تک لے جاؤ۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: سکواش کے ایک اچھے کھلاڑی کا مقصد بہتر ہونا ضروری ہے۔ آپ کے بازو بھی مضبوط ہونا چاہیے کیونکہ اکثر کھلاڑی مخالف پوزیشن میں بازو کے ساتھ باؤنس نہیں کرتا ہے۔ نقل و حرکت ایک ہاتھ سے کی جاسکتی ہے لیکن دونوں کو ساتھ رکھنا بھی ضروری ہے۔ مشق کرتے ہوئے اطراف کے خلاف گیند کو بار بار ماریں اس سے مہارت بھی حاصل ہوگی اور گیند کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی بھی بڑھے گی۔ دوڑنے کے دوران لمبے لمبے ڈگ بھرو اس سے جسم کے پٹھوں کو طاقت ملے گی اور پھیپھڑے بھی مضبوط ہونگے۔

آخر میں، بھائی نے مجھے ایک عُمدہ پیشکش کی کہ اگر تم پاکستان جونیئر چیمپئن کے فاتح بن جاتے ہو یا اس کے مساوی مقام پر پہنچ جاتے ہو تو تمہیں میں اپنے ساتھ انگلینڈ لے جاؤں گا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: یوں سمجھئے کہ ہمارے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا۔

نعیم طاہر: معاہدہ طے پا گیا۔ ہاہاہاہاہا۔۔۔۔۔

جہانگیر خان: مجھے اس معاہدہ سے بہت حوصلہ افزائی ملی۔ اب میرا ایک ہی عزم تھا کہ میں انگلینڈ جا کر کھیل کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی حاصل کروں۔

بالاتفاق اگلے برس پاکستان سے WORLD JUNIOR SQUASH CHAMPIONSHIP کے لیے ٹیم باہر جانا تھی۔ اس غرض سے باقاعدہ ٹرائلز لینے کا اعلان ہوا۔ جب پشاور میں ٹرائلز ہوئے تو میں نے باضابطہ حصہ لیا اور پہلے نمبر پر آیا۔

مجھے پہلی بار پاکستان بھر سے آئے کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملا اور مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ میں کس درجے کا کھلاڑی ہوں۔ میں نے انڈر 19 میں تمام لڑکوں کو شکست دی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: کراچی میں رہ کر بھی اگر مقابلوں میں حصّہ نہ لیں تو اس بات کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہوسکتا کہ آپ

کس درجے کے کھلاڑی ہیں۔ WORLD JUNIOR SQUASH CHAMPIONSHIP کے مقابلے انگلینڈ اور سویڈن دونوں ممالک میں ہو رہے تھے۔ لیکن میرا انتخاب انگلینڈ میں کھیلے جانے والے مقابلوں میں ہوا۔

نعیم طاہر: اُس وقت آپ کی عُمر کیا تھی؟

جہانگیر خان: یہ 1978ء کی بات ہے اور میں 14 برس کا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا یہ 1978ء کی بات ہے۔

جہانگیر خان: جی۔ اِس مقابلے میں دُنیا بھر سے اسکواش کے نامور کھلاڑیوں نے شرکت کی اور ان کے ساتھ کھیل کر مجھے اپنے کھیل کے معیار کا بھی اندازہ ہوا۔

نعیم طاہر: کیا آپ یہ مقابلہ ہار گئے؟

جہانگیر خان: میں فائنل تک پہنچ گیا اور فائنل میں ہار کر دوسرے نمبر پر رہا۔ میرے لیے یہ بھی بہت بڑے اعزاز کی بات تھی کہ میرا بین الاقوامی مقابلے میں کوئی تجربہ نہ تھا اور نہ ہی میں نے اس سطح پر کبھی کھیلا تھا۔ سارے کھلاڑیوں کا تعلق انگلینڈ، آسٹریلیا اور امریکہ سے تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود میں فائنل میں پہنچا۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

جہانگیر خان: میرے خیال میں یہ غیر مُلکی انڈر 19 کے کھلاڑی اپنی قد آور، صحت منداور توانا جسامت کی وجہ سے عُمر میں بڑے دکھائی دیتے تھے اور ہم اِن کے سامنے کوتاہ قد تھے۔

نعیم طاہر: اُس وقت آپ کا قد اور وزن کتنا تھا؟۔

جہانگیر خان: مجھے اپنا قد اور وزن تو یاد نہیں لیکن میں بہت دُبلا پتلا تھا اور جسمانی طور پر اتنا قوی نہیں تھا۔

نعیم طاہر: جیسے ایک بچہ، نوجوان کے ساتھ کھیل رہا ہو۔

جہانگیر خان: مجھے ایسے ہی لگ رہا تھا کہ جیسے نوجوان آدمی کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ کیونکہ انڈر 19 کے مقابلوں میں سترہ یہ اٹھارہ برس کو نوجوان کھلاڑی بھی حصّہ لے سکتے ہیں۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

جہانگیر خان: بہر حال میرا یہ بہت اچھا تجربہ رہا۔ میرے بڑے بھائی نے بھی میرا مقابلہ دیکھا اور مجھے بہتر سے بہترین کھیلتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

نعیم طاہر: آپ طورسم خان کی بات کر رہے ہیں؟

جہانگیر خان: جی بالکل۔ انہوں نے محسوس کیا کہ میں اب بہت اچھا کھیل رہا ہوں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: پھر میں پی۔ آئی۔ اے (PIA) کی ٹیم میں منتخب ہو گیا۔

نعیم طاہر: وہ کیسے؟

جہانگیر خان: نور خان صاحب کے زمانے میں پی۔ آئی۔ اے (PIA) نے یہ پیش کش کی کہ جو اس ٹیم میں منتخب ہو گیا اسے دُنیا بھر کا سفر پی آئی اے سے مُفت کرنے کی سہولت دی جائے گی اور اس کے ساتھ سپورٹس کمپلیکس (SPORTS COMPLEX) میں بھی تمام سہولیات میسّر ہوں گی۔ ان سہولیات سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے دُنیا بھر میں چھوٹے اور بڑے پیانے پر منعقد ہونے والے ہر مقابلے میں شرکت کی۔

نعیم: آپ نے پہلی بار AUSTRALIAN AMATURE CHAMPIONSHIP میں حصّہ لیا؟

جہانگیر خان: یہ 1979ء کی بات ہے کہ میں ایک سال تک اپنے بھائی طورسم خان کے پاس انگلینڈ میں مقیم رہا۔ کھیل کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ انہیں دنوں پاکستان میں AUSTRALIAN AMATURE CHAMPIONSHIP کے ٹرائلز شروع ہونے والے تھے۔ ویسے تو یہاں میں بڑی عُمر کے کھلاڑیوں کے ساتھ کافی مشقیں کرتا رہا تھا اور کافی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

جب میں گرمیوں میں پاکستان آیا تو آب وہوا کی تبدیلی کے باعث طبیعت کچھ ناساز ہو گئی۔ میں پیچش وغیرہ کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور دو دن بعد آزمائشی کھیل تھے۔ اس کے باوجود میں بہت سے لڑکوں سے جیتا بھی اور ہارا بھی۔ نور خان صاحب کو میرے ہارنے کا سبب معلوم تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: نور خان صاحب نے مجھے پی آئی اے (PIA) کی جانب سے آسٹریلیا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان اسکواش فیڈریشن (PAKISTAN SQUASH FEDERATION) کی بجائے میرے قیام وطعام کا تمام خرچ PIA برداشت کرے گا۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: آپ ٹیم میں منتخب نہیں ہوئے بلکہ اضافی کھلاڑی کے طور پر جا رہے تھے۔

جہانگیر خان: اسکواش ٹیم چار کھلاڑیوں پر مشتمل تھی، دو کھلاڑی اضافی بھیجے گئے تھے۔

نعیم طاہر: نور خان صاحب کو آپ کی مہارت پر بھرپور اعتماد تھا۔

جہانگیر خان: جی ہاں۔ نور خان صاحب نے کہا کہ اس نے WORLD JUNIOR SQUASH CHAMPIONSHIP میں بھی شرکت کی ہے اور اس کے گذشتہ نتائج بھی اچھے رہے ہیں۔ صحت کے مسائل کی وجہ سے آزمائشی ٹیسٹ میں اچھی کارکردگی نہیں دکھا رہا اور صرف اس وجوہ کی بنیاد پر اس مقابلے میں شمولیت سے نہیں روکا جاسکتا۔ یوں مجھے میلبرن (Melbourne) میں کھیلنے کا موقع مل گیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: اتفاق سے ایک کھلاڑی نہ آیا تو مجھے اپنا پہلا سویڈن کے LARS KVANT کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملا۔

نعیم طاہر: اتفاق سے۔۔۔۔۔ہاہاہاہا۔

جہانگیر خان: مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس مقابلے کے آغاز میں میری کارکردگی اتنی متاثر کُن نہ تھی۔ میرے اور LARS KVANT کے پوائنٹس میں کافی فرق تھا۔ 1-5، 2-5 اس تناسب سے مقابلہ جاری تھا۔ ایک دم سے کھیل کا پاسا اُلٹ گیا۔ اور میری ہار جیت میں بدل گئی۔ میں یہ مقابلہ 2-3 سے جیت گیا۔

نعیم طاہر: یہ وہی مقابلہ ہے جس میں آپ نے کفیل (SPONSOR) کی قمیض تبدیل کر کے پاکستان کی قمیض پہن لی تھی؟

جہانگیر خان: جی ہاں یہ بالکل صحیح بات ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل کُچھ یوں ہے کہ میں نے اس مقابلے کا آغاز پاکستانی قمیض پہن کر ہی کیا۔ اور تمام مقابلے جیتتے ہوئے فائنل میں پہنچ گیا۔ اب ہمارے فائنل کا وہ کفیل تھا تو اُنہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میں اُن کی قمیض پہن کر کھیلوں۔ میں اس بات سے دِلی طور پر مطمئن نہیں تھا لیکن مجھے مجبوراً اُن کی یہ بات ماننا پڑی۔ جب میں نے پہلے دورانیہ کا کھیل کھیلا تو میری کارکردگی زیادہ اچھی نہ تھی اور میں بہت زیادہ پوائنٹس کے فرق سے ہار گیا۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

جہانگیر خان: مجھے ایک دم محسوس ہوا کہ پاکستانی قمیض میرے لیے خوش بختی کا باعث ہے تو میں نے اُسی لمحے اسکواش کورٹ سے باہر آ کر کفیل کی قمیض اتار کر پاکستانی قمیض پہن لی اور اُس کے بعد میں ہر مقابلہ جیتا۔ آخرکار میں نے یہ مقابلہ 1-3 سے جیت لیا۔ میری فتح نہ صرف میرے لیے بلکہ سب کے لیے تعجب خیز تھی۔ میرے لیے یہ جیت میری توقعات سے بھی بڑھ کر تھی۔ میں نے شب و روز اس کھیل کی مشق کرنے میں صرف کیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس درجے پر کھیلتا تھا لیکن میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری محنت کا پھل مِل گیا۔

نعیم طاہر: آپ بطور اضافی کھلاڑی گئے اور اسکواش ٹیم کے رُکن بھی نہ تھے اس کے باوجود آپ نے کھیلا اور چیمپئن شپ بھی جیت لی۔

جہانگیر خان: جی جی۔ باقی کھلاڑیوں میں کوئی پہلے مقابلہ میں ہی یا کوئی کوارٹر فائنل میں ہی ہار گیا۔

نعیم طاہر: اچھا یہاں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ ایک دم دُنیا بھر میں نامور کھلاڑی کے طور پر سامنے آ گئے اور ہر طرف آپ کے نام کا چرچا ہو گیا، آپ کیسا محسوس کرتے تھے؟

جہانگیر خان: حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مجھے اپنے ورلڈ چیمپئن بننے کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ میری یہ کامیابی نہ صرف اس مقابلے میں حصّہ لینے والے کھلاڑیوں اور تماشائیوں کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے لوگوں کے لیے حیران کُن تھی۔ لیکن میری سوچ سے بالاتر تھی۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ اچھا۔

جہانگیر خان: جب میں آسٹریلیا سے پاکستان آیا اور کُچھ عرصہ بعد دوبارہ انگلینڈ گیا تو اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ دُنیا بھر کے اسکواش کے اخبارات و رسائل کی شہ سُرخیوں کی زینت میری ہی کامیابی کی خبریں بنیں۔

An Unknown Boy has won the World Australian Amature Championship.

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: نہ صرف بین الاقوامی بلکہ قومی سطح کے اخبارات و رسائل میں بھی ونڈر بوائے (WONDER BOY) کے نام سے مشہور ہو گیا۔ تو اُس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کوئی غیر معمولی کامیابی

Scanned with CamScanner

حاصل کی ہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

جہانگیر خان: جب میں انگلینڈ گیا وہاں پر بھی لوگوں نے مجھ سے ملاقات کی خواہش کی۔ مجھے اسکواش کھیلنے کی دعوت دی۔ ان تمام باتوں نے میرے اندر آگے بڑھنے کا خاص قسم کا جوش و جذبہ اُجاگر کر دیا اور میں بھی اپنی کامیابی پر متعجب تھا۔

نعیم طاہر: یعنی آپ نے خود کو بھی حیران کر دیا۔

جہانگیر خان: جی۔

نعیم طاہر: اس جیت نے آپ کے اندر خود اعتمادی بھی پیدا کی ہوگی۔ کامیابی کا یہ سفر کن کٹھن راستوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھا؟

جہانگیر خان: اس بہت بڑی خوشی کے بعد ہمیں ایک بہت بڑے سانحے سے گزرنا پڑا۔ میں نے اس چیمپئن شپ میں 15 اکتوبر 1979ء میں فتح حاصل کی اور اس کامیابی کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد 28 نومبر 1979ء کو میرے بڑے بھائی طورسم خان کا انتقال ہو گیا۔

نعیم طاہر: آپ کے بڑے بھائی؟

جہانگیر خان: وہ میرے استاد، دوست بھائی تھے۔ میری ان سے دلی وابستگی بہت زیادہ تھی۔ وہ میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ تھے۔ مجھے زندگی میں بہت سے لوگ ملے لیکن ان کے جیسا کوئی نہیں ملا۔

نعیم طاہر: جب آپ آسٹریلیا میں کھیل رہے تھے تو اس وقت بھی آپ ہر قدم پر اُن سے رہنمائی لیتے تھے۔

جہانگیر خان: جی بالکل میری ہر روز اُن سے فون پر بات ہوتی تھی۔ کیونکہ ان کی دی ہوئی ہدایات میرے اندر ایک خود اعتمادی پیدا کر دیتی تھیں اور مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اگر ان کی بتائی ہوئی حکمت عملی اختیار کروں گا تو جیت جاؤں گا۔

میں جس بھی حریف کھلاڑی کے بارے میں پوچھتا کہ اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے کن ہدایات پر عمل کروں تو وہ میری مکمل رہنمائی کرتے۔

نعیم طاہر: وہ بہت ماہر کھلاڑی تھے اور جزئیات میں آپ کو سمجھاتے کہ جیت کے لیے کھیل کے دوران کیسی حکمت عملی اپناؤ۔

جہانگیر خان: بعض اوقات وہ مجھے پیار سے ''بابو'' بھی کہتے۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ اچھا۔

جہانگیر خان: بابو اگر میری بتائی ہوئی تجاویز پر عمل کرو گے تو سو فیصد فتح یقینی ہے۔ میں باقاعدگی سے روزانہ میچ جیتنے کے بعد اُن کو فون پر اپنی کامیابی کی نوید سُناتا۔

اکثر تو اپنے آسٹریلوی دوستوں کے ذریعے بھی میچ کے دوران براہ راست نتائج معلوم کرتے رہتے۔ ہر لمحہ مقابلے کی صورتحال جاننے کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ براہ راست رابطے میں رہتے تھے۔

نعیم طاہر: وہ ایک بہترین کھلاڑی ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے لیے بھی فیض بار تھے۔

جہانگیر خان: جی۔

نعیم طاہر: کیا طورسم خان کا اسکواش کھیلنے کو دوران انتقال ہوا؟

جہانگیر خان: وہ آسٹریلیا کے شہر ایڈیلیڈ (Adeliede) میں آسٹریلین اوپن اسکواش ٹورنامنٹ کے ایک میچ کھیلتے ہوئے دل کا شدید دورہ پڑنے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ یہ اسکواش کی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا جب کوئی کھلاڑی کھیل کے دوران اسکواش کورٹ میں فوت ہوا۔

نعیم طاہر: اس جان لیوا حادثے نے آپ کو گہرے صدمے سے دوچار کر دیا ہوگا؟

جہانگیر خان: یقین کریں میں نے تو اسکواش کھیلنا ہی چھوڑ دی تھی۔ مجھے اس کھیل سے ہی تنفر ہو گیا تھا۔ کیا عجب سانحہ تھا کہ جس کھیل کے لیے میں اتنا پُرعزم تھا اسی کھیل نے میرے بھائی کی جان لے لی۔ تین چار ماہ میں بالکل غم سے نڈھال رہا۔ لیکن پھر میرے دوست، احباب اور گھر والوں نے میری ڈھارس بندھائی کہ غم اور خوشی تو زندگی کا حصّہ ہیں۔ جو خواب طورسم خان کا تھا تم اُس کی تعبیر کرو۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: طورسم خان نے وفات سے کچھ عرصہ پہلے مجھے فون پر کہا تھا میری یہ خواہش ہے کہ میں اپنا اسکواش کھیل چھوڑ کر تم پر مکمل توجہ دوں تاکہ تم اس کھیل میں بہت اونچا مقام حاصل کرو۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: میرا مزید کھیلنے کا ارادہ نہیں ہے۔ میں اس کھیل سے ریٹائرمنٹ لے لوں گا۔ میری آرزو ہے کہ تم عالمی چیمپئن بنو۔

میں نے اپنے بھائی کی اس خواہش کو لے کر دوبارہ کھیل کا آغاز کیا۔ میں نے وقت کی پرواہ کیے بغیر

Scanned with CamScanner

دن رات محنت کی۔ رات کے ڈھائی بجے بھی دوڑ لگائی۔ صبح چار بجے بھی مشق کی۔ دوپہر کی سخت گرمی میں بھی کھیلا۔ مجھے اسکواش کی مشق کرنے کے علاوہ کچھ بھی کرنا پسند نہ تھا۔ کیونکہ میں نے طے کرلیا تھا کہ مجھے اپنے بھائی کا خواب پورا کرنا ہے۔ مجھے اللہ پاک کی مدد اور رہنمائی ہمیشہ حاصل رہی۔ میری تنظیم (Squash Federation) اور استاد کا بھی ساتھ رہا۔

ٹھیک دو سال کے اندر 1981ء میں، میں نے Men's world open squash championship میں انگلینڈ کے Geoff Hunt کو شکست دی۔

نعیم طاہر: آپ کے اندر اپنے بھائی کی محبت اور ان کی خواہش کی تکمیل کا ایک جذبہ تھا جو آپ کو اس بلند مقام پر لے آیا۔ کہ آپ صرف سترہ برس کی عُمر میں عالمی چیمپئن بن گئے۔

لیکن اس عرصہ میں آپ کے بھائی کی موت کے صدمے سے نکال کر اسکواش کورٹ میں لانے والے کون تھے؟ جنہوں نے آپ کے بھائی کے بعد بطور کوچ آپ کی قدم قدم پر رہنمائی کی؟

جہانگیر خان: میرے والد صاحب اور میرے چچازاد بھائی رحمت خان نے بطور کوچ غم کی کیفیت سے نکال کر واپس کورٹ لے جانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ رحمت خان پاکستان کے قومی کوچ بھی تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: طورسم خان کی وفات نے میری زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ بھائی کی وفات کے وقت میں تقریباً پندرہ برس کا تھا۔ ناپختہ ذہن کا مالک تھا اور جذبات میں آکر کوئی بھی غلط قدم اُٹھا سکتا تھا۔ لیکن میرے والد اور رحمت خان کے تعاون سے ہی آج اس مقام پر پہنچا ہوں۔

نعیم طاہر: دوست احباب کا ساتھ، بھائی کی محبت اور کُچھ کر دکھانے کا عزم آپ کی کامیابی کا سبب بنا۔

جہانگیر خان: مجھے یقین ہے۔ جس انسان میں کُچھ کر دکھانے کا جذبہ اور ہمت ہو تو اللہ بھی ان کا سہارا بن جاتا ہے جو اپنی راہ کی جستجو میں مگن ہو جائیں۔ اُس وقت مجھے اپنے بھائی کے خواب کی تعبیر ناممکن نظر آتی تھی لیکن آج جب میں پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے خود بھی یقین نہیں آتا کہ اتنی کم مدت میں مجھے اتنی زیادہ کامیابیاں سمیٹنے کا موقع مِلا۔ شاید اگر آج مجھے کہا جائے یہ سب کر کے دکھانے کو تو میرے لیے ناممکن ہوگا۔ لیکن اُس وقت میرے اندر کچھ کر دکھانے کا جذبہ تھا جو مجھے آج اس مرتبہ پر لے آیا۔

نعیم طاہر: GEOFF HUNT تو بہت بڑا کھلاڑی تھا اس مقابلے کے بارے میں کُچھ بتایئے؟

جہانگیر خان: میری جیت کا سہرا رحمت خان کے سَر ہے وہ میری جسمانی و اعصابی طاقت برقرار رکھنے کے لیے

سخت تربیت کرواتے تھے۔ GEOFF HUNT لگاتار چار سال سے عالمی اعزاز جیت رہا تھا۔ وہ میرے لیے ایک مثالی کھلاڑی تھا۔ جب میں نے UNDER 19 کھیلنا شروع کیا تو اُس وقت مجھے دوبار اُن کو دیکھنے کا موقع ملا وہ ایک تربیت یافتہ اور ماہر کھلاڑی تھے۔ میں اپنی تربیتی مشق کے دوران اس کی آزمودہ حکمت عملی کو اپنانے کی کوشش بھی کرتا تھا۔

دُنیا بھر سے اسکواش کا کھلاڑی اس کو شکست سے دوچار نہیں کرسکتا تھا۔ 1981ء میں پہلی بار جیف ہنٹ کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملا۔

نعیم طاہر: 1981ء میں؟

جہانگیر خان: جی۔ جرمن کینیڈین کلب (GERMAN CANADIAN CLUB) کی جانب سے ہم جرمنی میں ایک اسکواش مقابلہ کھیل رہے تھے۔ اس مقابلے میں دیگر کھلاڑیوں کے علاوہ جیف ہنٹ بھی شریک تھے۔

نعیم طاہر: اُس وقت آپ کتنے برس کے تھے۔

جہانگیر خان: میں سترہ سال کا ہوں گا۔

نعیم طاہر: اور جیف ہنٹ کی عُمر کیا ہوگی؟

جہانگیر خان: وہ 33 برس کے تھے۔

نعیم طاہر: جیف ہنٹ تو اپنے زمانہ' عروج اور عالم شباب میں تھے۔

جہانگیر خان: ہم دونوں فائنل مقابلے کے لیے منتخب ہوئے۔ ہار جیت سے قطع نظر میرے لیے یہی بہت بڑے اعزاز کی بات تھی کہ میں اس کے ساتھ فائنل مقابلہ کھیل رہا ہوں۔

نعیم طاہر: آپ نے یہ مقابلہ جیتنے کے لیے بہت کوشش کی ہوگی۔

جہانگیر خان: جی بالکل۔ میں نے اس مقابلے میں اپنی تمام تر محنت، مہارت اور حکمت عملی لگا دی۔ میں اس مقابلے کا پہلا دورانیہ ہار گیا لیکن بہت زیادہ محنت اور کوشش کے بعد دوسرا اور تیسرا دورانیہ جیت گیا۔ میں اُس کو 1-3 سے شکست دی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: میرے لیے یہ ناقابلِ یقین بات تھی کہ میں یہ مقابلہ جیت گیا۔ میں کورٹ سے باہر آیا تو کوچ نے میرے کھیل کی بہت تعریف کی۔ میں نے کوچ سے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ نتیجہ ہی غلط آیا ہے۔

Scanned with
CamScanner

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

جہانگیر خان: جیف ہنٹ کی یہ قابلیت تھی کہ وہ بہت محو ہو کر پوری جان کی بازی لگا کر کھیلتا تھا اور مقابلے کے بعد ہمیشہ حریف کے کھیل کو سراہتا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: اس مقابلے کے بعد وہ خاص طور پر میرے پاس آیا اور میرے کھیل کی بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ میری طرح عالمی چیمپئن بنے گا۔

نعیم طاہر: یہ جیف ہنٹ نے کہا۔

جہانگیر خان: جی بالکل۔ جیف ہنٹ تقریباً نو مقابلوں میں میرے مدِ مقابل رہا اور مجھے سب سے زیادہ لُطف اُسی کے ساتھ کھیلنے میں آیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: جیف ہنٹ پیشہ ور کھلاڑی تھا۔ وہ اسکواش کھیلتے ہوئے اس کے اصول وضوابط کی پیروی کرتا تھا۔ حریف کھلاڑی کے لیے نازیبا الفاظ استعمال نہیں کرتا تھا۔ کھیل کے دوران دفاع کرتے ہوئے اپنی طاقت اور صلاحیت کا ناجائز استعمال بھی نہیں کرتا تھا۔ اکثر کھلاڑی جیتنے کے بعد اپنے حریف کی تضحیک کرتے لیکن جیف ہنٹ ہمیشہ اپنے مدِمقابل کھلاڑی کی تعریف کرتا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: وہ اس کھیل میں پیشہ ورانہ صلاحیت، قابلیت اور مہارت رکھتا تھا۔ میرے اور جیف ہنٹ کے درمیان اڑھائی گھنٹے سے کم کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔ میں اُس کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے ایک خاص تیاری کے ساتھ آتا تھا۔

نعیم طاہر: آپ نے جیف ہنٹ سے ناقابلِ یقین فتح تو حاصل کرلی، کیا اُس نے آپ سے اپنی شکست کا بدلہ بھی لیا؟

جہانگیر خان: اگلے ہی ہفتے جیف ہنٹ نے ایک مقابلے میں مجھے 3-0 سے شکست دے دی۔ اس مقابلے میں اُس نے حکمت عملی اور طریقہ کار بالکل تبدیل کرلیا۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

جہانگیر خان: اس انداز سے میں نے کھیل میں کافی تکنیکی مہارت بھی حاصل کی۔ جیسے جیسے میں جیف ہنٹ کے

ساتھ کھیلتا رہا تھا میرے کھیل میں بھی بہتری آرہی تھی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: اس مقابلے سے ایک ہفتہ پہلے جیف ہنٹ نے 1981ء کے Men's British Open Squash Championship میں مجھے فائنل میں شکست دے کر ہاشم خان کا سات بار برٹش اوپن جیتنے کا ریکارڈ بھی توڑا تھا۔

ذنعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: اس مقابلے کے بعد میں نے کسی بھی اور مقابلے میں اس سے شکست نہیں کھائی۔

نعیم طاہر: شاید آپ دونوں ایک دوسرے کی حکمت عملی اور تکنیکی انداز کو سمجھ گئے تھے۔

جہانگیر خان: جی۔ ہم دونوں کی حکمت عملی اور تکنیکی انداز تقریباً ایک جیسا تھا۔ جسمانی وذہنی صلاحیت وقابلیت کا معیار بھی برابر تھا۔ دفاعی انداز بھی قدرے یکساں تھا۔ اب اس سخت مقابلے، میں کسی بھی وقت کمزور پڑ گئے تو اس کا مطلب شکست تھا۔

نعیم طاہر: آپ یہ بتائیں کہ جیف ہنٹ کے ساتھ مقابلے میں ایسی کیا تکنیکی مہارت یا تدابیر اختیار کرتے کہ اتنے طویل عرصے بعد اُسے ہرانے میں بھی کامیاب ہوگئے؟

جہانگیر خان: میری جسمانی صلاحیتیں استوار ہوئیں۔ کھیل کی رفتار میں تیزی آئی۔ میں نے گیند کو اچھالنے میں بھی کافی تکنیکی مہارت حاصل کی اور سب سے اہم بات کہ بہت تحمل سے کھیلا۔ کبھی جلد بازی سے کام نہیں لیتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں یہی حکمت عملی کو اپنائے رکھا اور مقابلے کا دورانیہ دو گھنٹے سے زیادہ طویل ہو گیا تو جیف ہنٹ کا حوصلہ یا ہمت جواب دے جائے گا۔

نعیم طاہر: اس کھیل میں مہارت کے ساتھ ساتھ ہمت اور حوصلہ بھی اہم ہے۔

جہانگیر خان: جی بالکل۔ صبر وتحمل اس کھیل کا لازمی جزو ہے۔

نعیم طاہر: بظاہر تو آپ دونوں تحمل مزاج کھلاڑی تھے لیکن اس مقابلے میں جیف ہنٹ کے مضبوط اعصاب آپ کے سامنے جواب دینے لگے۔

جہانگیر خان: مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب میں 1981ء میں کینیڈا کے شہر ٹورنٹو (TORONTO) میں Men's World Squash Championship کا فائنل مقابلہ جیف ہنٹ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس مقابلے کے آخری مراحل میں اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے نہ صرف

اپنا ریکیٹ پھینک دیا بلکہ میرے لیے نازیبا الفاظ بھی استعمال کیے۔ اس کا رویہ میرے لیے غیر معمولی تھا کیونکہ یہ بات اُس کے مزاج کے برعکس تھی۔ تاہم اس کھیل کے اختتام پر اُس نے میرے اس انداز کو بہت سراہا اور یہ بھی کہا کہ جو حکمت عملی میں دوسروں پر آزماتا ہوں وہی تم نے میرے لیے آزمالی۔

نعیم طاہر: اور یوں اسکواش کی حکمرانی کا تاج جیف ہنٹ کے سر سے اُتر کر آپ کے سر چڑھ گیا۔

جہانگیر خان: یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات تھی کہ اسکواش کا اتنا بڑا کھلاڑی میرے کھیل کی تعریف کر رہا ہے۔ اس کامیابی کے بعد میری جیت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو کہ پانچ سال آٹھ ماہ تک برقرار رہا اور وہ بھی مسلسل ناقابلِ شکست رہا۔ اس دوران میں نے 555 مقابلے جیتنے کا ریکارڈ قائم کیا۔

نعیم طاہر: پانچ سال آٹھ ماہ تک آپ ہارے ہی نہیں اور جیتتے ہی چلے گئے۔

جہانگیر خان: میرے خیال سے میں نے جیف ہنٹ جیسے تربیت یافتہ، غیر معمولی اور پیشہ ور کھلاڑی کو شکست دینے میں بہت محنت کی اور یہ میری زندگی کا مقصد بھی تھا۔

نعیم طاہر: واہ۔

جہانگیر خان: یہ لازم نہیں کہ اسکواش کا ہر کھلاڑی ایک ہی جیسی حکمت عملی یا تدبیر اختیار کرے۔ ایک ہی نقطے پر توجہ مرکوز رکھنا بہت مُشکل ہے۔ ان مقابلوں کے دوران میری طبیعت بھی ناساز ہوئی۔ جسمانی صحت بھی متاثر ہوئی لیکن اللہ پاک کی مدد و رہنمائی سے میں نے کھیل کے دوران ہمیشہ اپنا توازن برقرار رکھا۔

نعیم طاہر: دنیا بھر میں آپ کی یکے بعد دیگرے فتوحات کی دھوم کا چرچا گردش کرنے لگا۔ آپ کی کامیابیوں کی خبر پوری دُنیا کے اخبارات و رسائل کی شہ سُرخیوں کی زینت بن گئی۔ ہر مقابلے کے بعد ایک ہی کہانی سامنے آتی کہ جہانگیر خان نے اپنے حریف کو روند کر رکھ دیا کئی بار تو ایک سیٹ ہارے بغیر بھی جیت جاتے۔

جہانگیر خان: بعض لوگ تو یہ کہتے کہ ہم اس کی جیت دیکھنے نہیں آئے ہم تو اس کو ہارتا دیکھنے آئے ہیں۔ میرے اوپر میری قوم کا بھی بہت دباؤ تھا۔ اُن کے نزدیک میرے لیے کسی بھی حریف کو ہرانا معمولی بات تھی تو اُن کی توقعات پر بھی پورا اُترنا ضروری تھا۔ پھر میں نے مقابلہ جیتنے کے لیے ہر ممکن کوشش، محنت، مہارت اور لگن سے کام لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا اس بات پر بھی یقین ہے کہ ہار

جیت تو کھیل کا حصّہ ہیں۔

نعیم طاہر: دُنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ہار اور جیت دونوں کیفیات میں توازن رکھتے ہیں۔ کیسے بھی حالات ہوں اپنی شخصیت کو بکھرنے نہیں دیتے۔ جہانگیر خان کا شمار بھی انہیں لوگوں میں ہوتا ہے۔ جو کامیابیوں اور ناکامیوں کے اس سفر میں ہمت اور حوصلہ قائم رکھتے ہوئے کھیل کے میدان میں جمے رہتے ہیں اور مقابلہ کرتے ہیں۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ ان مسلسل فتوحات کے بعد جب اخبار میں یہ ناقابلِ یقین خبر پڑھی کہ جہانگیر خان مقابلہ ہار گئے ہیں تو میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ اب شاید جہانگیر خان دلبرداشتہ ہو کر کھیل سے ریٹائرمنٹ لے لیں۔

لیکن آپ کا بیان بالکل اس کے برعکس تھا۔ آپ نے کہا کہ اس میں کیا عجب بات ہے۔ ہار، جیت تو کھیل کا حصّہ ہے۔ کوئی کامیابی آخری نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی ناکامی جان لیوا ہے۔ نہ تو جیت سدا کے لیے ہے اور نہ ہی ہار ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے۔

جہانگیر خان: جی بالکل۔ اسکواش کے اس سفر میں مجھے بہت کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن پھر کھیل میں ہار بھی ایک فطری بات ہے۔ میں کوئی غیر معمولی کھلاڑی تو نہیں ہوں جو کبھی شکست سے دوچار نہ ہو۔

نعیم طاہر: اس بات میں کوئی شائبہ نہیں کہ آپ غیر معمولی کھلاڑی تو ہیں۔

جہانگیر خان: یہ تو آپ کی اور میری قوم کی محبت ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

جہانگیر خان: کھیل کا میدان تو شکست اور ناقابلِ شکست کا امتزاج ہے۔ میں نے لگاتار دس مرتبہ برٹش اوپن اسکواش چیمپئن شپ جیتنے کا اعزاز حاصل کیا۔

نعیم طاہر: لگاتار دس بار۔

جہانگیر خان: 1981ء سے لے کر 1991ء تک۔

نعیم طاہر: بہت خوب۔

جہانگیر خان: ان دس برسوں میں بہت سے اُتار چڑھاؤ بھی آتے رہے۔ برٹش اوپن اسکواش چیمپئن شپ کا اعزاز حاصل کرنا میری زندگی کا اوّلین مقصد تھا۔

1981ء میں جیف ہنٹ نے ہی مجھے برٹش اوپن کے فائنل میں ہرا کر ہاشم خان کا سات بار برٹش

اوپن جیتنے کا ریکارڈ توڑا تھا۔ اور میں اس اعزاز کو واپس اپنے ملک میں لانا چاہتا تھا۔ اور اللہ پاک کی مدد سے میں نے یہ اعزاز مسلسل دس مرتبہ حاصل کیا۔

نعیم طاہر: کیا آپ کے ریکارڈز کو کسی نے آج تک توڑا بھی ہے؟

جہانگیر خان: میرا چھ مرتبہ ورلڈ اوپن اسکواش ٹورنامنٹ کا ریکارڈ تو جان شیر خان توڑ چکے ہیں۔ لیکن دس مرتبہ برٹش اوپن چیمپئن شپ اور 1981ء اور 1986ء تک ہرنا قابلِ شکست مقابلے کا ریکارڈ نہیں ٹوٹا۔

نعیم طاہر: کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ ریکارڈ ٹوٹے؟

جہانگیر خان: ریکارڈ تو بنتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔ میرے سے پہلے بھی کھلاڑیوں کے ریکارڈ ٹوٹے۔ میں اپنا ریکارڈ ٹوٹ نہ سکنے کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا مگر خواہش ضرور ہے کہ میرا یہ اعزاز برقرار رہے۔

نعیم طاہر: آپ کا سب سے طویل مقابلہ دو گھنٹے اور چھیالیس منٹ پر مشتمل ہے۔ کیا اس کا بھی ریکارڈ ابھی تک قائم ہے؟

جہانگیر خان: جی یہ ریکارڈ ابھی تک برقرار ہے۔ اس مقابلے میں مصر کے کھلاڑی ملک کمال میرے مدِ مقابل تھے۔

نعیم طاہر: آپ کے مثالی استاد، دوست، بڑے بھائی طورسم خان تھے۔ جن سے آپ کو بہت سے رہنمائی ملی۔ ان کے دُنیا سے رُخصت ہو جانے کے بعد آپ کے چچازاد بھائی رحمت خان آپ کے لیے فیض بار ثابت ہوئے۔ کیا آپ اپنے خاندان کی نسل نو میں کوئی ایسا ستارہ دیکھتے ہیں کہ جس کو آپ بھی اسکواش کے افق پر نمودار کر سکیں؟

جہانگیر خان: ہماری نوجوان نسل میں تو کوئی ابھی کوئی سامنے نہیں آیا۔ آج کل کمپیوٹر کا دور ہے سب کی دلچسپی اسی جانب مبذول ہے۔ جبکہ میرے ہم عمر کزنز نے Under 19 اسکواش کھیلی اور جبکہ دُنیا کے مُختلف ممالک میں بطور کوچ تعینات ہیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج کے دور کے نوجوان میں جذبہ، محنت، ہمت، جسمانی قابلیت وصلاحیت اور طاقت ور توانا ہونا ضروری ہے۔

نعیم طاہر: کیا اس کھیل میں جسمانی طور پر طاقت ور و توانا ہونا ضروری ہے؟

جہانگیر خان: اس وقت اسکواش کھیل کی دنیا میں پہلے نمبر پر ہے جس میں جسمانی و ذہنی طور پر قوی، زور آور اور تنو

مند ہونا لازمی ہے۔ غیر مُلکی اس کے لیے Physical Chess کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

کھلاڑی کی جسمانی حرکات وسکنات اور ذہنی حکمت عملی اور تدبیر میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ ہر لمحہ توجہ گیند پر مرکوز ہو۔

نعیم طاہر: یہ تو بہت ہی مُشکل کھیل ہے۔

جہانگیر خان: دو سے ڈھائی گھنٹے کے مقابلے کے لیے روزانہ آٹھ سے نو گھنٹے مشق کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر میں جب مشق کرتا تھا تو صُبح پانچ بجے دس میل دوڑتا تھا۔ اس کے علاوہ دو سو یا چار سو گز کی بہت تیز دوڑ بھی لگاتا تھا۔

اس کے بعد گھر آکر ناشتہ کرتا۔ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد اسکواش کورٹ میں پانچ سے چھ لڑکوں کے ساتھ پانچ گھنٹے مشق کرتے۔ شام کو ورزش گاہ (Gymnasium) جاتا اور جسم کے پٹھوں کو مضبوط وطاقت ور کرنے کے لیے باقاعدہ ورزش کرتا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: سات گھنٹے بعد تیراکی کے لیے جاتا تھا۔ تو یہ میرا روزانہ کا معمول تھا۔

نعیم طاہر: آپ نے اپنا سارا وقت اسکواش کے لیے وقف کر رکھا تھا تو ایسے میں معاشی معاملات کی کیسی دیکھ بھال کرتے تھے؟

جہانگیر خان: جب ہم عالمی سطح پر کھیلتے ہیں تو بہت سے نامور کاروباری ادارے ہماری کفالت کرتے ہیں تو یہ ایک کل وقتی پیشہ بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم معاشی طور پر مستحکم ہوتے ہیں۔ آغاز میں کُچھ معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر جب Under 19 یا قومی سطح پر کھیلیں لیکن آج کے دور میں اسکواش کی تنظیمیں یا کھلاڑی جس ادارے میں کام کر رہا ہوں وہ بہت زیادہ تعاون کرتے ہیں کہ کسی بھی طرح کی معاشی دشواری نہیں ہوتی۔

نعیم طاہر: آپ نے زندگی میں بیش بہا کامیابیاں سمیٹنے کے بعد کب اس کھیل کو خیر آباد کہا۔

جہانگیر خان: میرا Under 19 سے عالمی سطح تک اسکواش کھیلنے کا سفر سولہ برس پر مشتمل ہے، میں نے 1993ء میں اس کھیل سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

Scanned with CamScanner

جہانگیر خان: میں نے اپنا آخری الوداعی مقابلہ 1993ء میں ورلڈ اوپن اسکواش چیمپئن شپ (World Open Squash Championship) کراچی میں کھیلا۔ اس مقابلے میں ہم نے آسٹریلیا کی ٹیم کو شکست دی تھی۔ اور انفرادی طور پر فائنل میں جان شیر خان میرے مدِ مقابل تھا۔

نعیم طاہر: کیا آپ نے شادی بھی کی؟ اس بات کا تو ذکر ہی نہیں ہوا۔

جہانگیر خان: جی میں نے 1995ء میں شادی کی۔

نعیم طاہر: ریٹائرمنٹ کے بعد؟

جہانگیر خان: کھیل کے دوران زندگی بہت مصروف رہتی ہے۔ گھر والوں کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہماری تمام تر توجہ صرف کھیل پر مرکوز ہوتی ہے۔ میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ہی شادی کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

نعیم طاہر: آپ نے اپنی پسند سے یا والدین کی مرضی سے شادی کی؟

جہانگیر خان: والدین کی پسند سے۔

نعیم طاہر: کتنے بچے ہیں؟

جہانگیر خان: میرے چار بچے ہیں۔ میرا دو برس کا بیٹا ہے۔ اگر اس کی اسکواش کھیلنے میں دلچسپی ہوئی تو اس کی ہر طرح رہنمائی کروں گا۔ لیکن زبردستی کھیلنے پر مجبور نہیں کروں گا۔

نعیم طاہر: کیا کھیل کے علاوہ موسیقی میں بھی دلچسپی ہے؟

جہانگیر خان: جی میں موسیقی بہت شوق سے سُنتا ہوں۔ اتنی مصروف زندگی میں موسیقی ہی پُر سکون اور تر وتازہ کر دیتی تھی۔ مجھے میڈم نور جہاں، مہدی حسن اور نصرت فتح علی خان کے گائے ہوئے گیت بہت پسند ہیں۔

نعیم طاہر: کیا گانا گاتے بھی ہیں؟

جہانگیر خان: نہیں۔ کبھی نہیں گایا۔

نعیم طاہر: زندگی کا وہ کونسا لمحہ ہے جس میں کسی مثالی و پسندیدہ شخص سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا؟

جہانگیر محمد علی باکسر۔

نعیم طاہر: اچھا۔

جہانگیر خان: وہ میرا مثالی کھلاڑی تھا۔ جس طرح کے ماحول میں رہ کر اُس سے ملاقات میری سب سے بڑی

خواہش تھی۔

نعیم طاہر: جی۔

جہانگیر خان: تقریباً پندرہ سال پہلے محمد علی باکسر سے میری ملاقات دو سے تین بار اتفاقاً ہوئی۔ وہ ایک تاریخ ساز اور شہرہ آفاق شخصیت کے مالک تھے۔

نعیم طاہر: انگلینڈ میں قیام کے دوران وزیر اعظم اور شاہی خاندان کے افراد سے بھی ملاقات ہوتی ہوگی۔

جہانگیر خان: میں سولہ برس انگلینڈ میں قیام پذیر رہا اور وہاں ان سب سے ملاقات ہوتی تھی۔

نعیم طاہر: غصہ کس بات پر آتا ہے۔

جہانگیر خان: جب کوئی غلط بیانی کرے یا کسی کے ساتھ ناحق زیادتی کرے۔

نعیم طاہر: آپ کی آمد کا بہت بہت شکریہ۔

☆☆☆

اختتامیہ:

ناظرین، بلاشبہ جہانگیر خان پاکستان کے عظیم کھلاڑی ہیں۔ جنہوں نے اپنے شاندار کارناموں سے پاکستان کا نام دنیا بھر میں روشن کیا۔ ایک ہی شہر پشاور سے تعلق رکھنے والے سات اسکواش چیمپئنز نے 50 سال تک اسکواش کی دُنیا پر راج کیا۔ اور دُنیا بھر میں پاکستان کا نام جگمگا دیا۔ پوری پاکستانی قوم ''خان'' خاندان کی ان تاریخ ساز کارناموں کی تہہ دل سے مشکور ہے۔

نعیم طاہر

☆☆☆

بہرام ڈی اواری

ابتدائیہ:

ناظرین ایک مرتبہ پھر پروگرام "اِن کیمرہ" میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ "اِن کیمرہ" یہ پروگرام جس کا میں پہلے بھی تذکرہ کرتا رہتا ہوں کہ اِس کا تعلق کسی نہ کسی طریق سے ہماری تاریخ سے جُڑتا ہے، اور تاریخ صرف بادشاہ، وزراء اور امیر کبیر شخصیات ہی نہیں بناتیں، تاریخ تو میں، آپ اور ہم سب مل کے بناتے ہیں۔ یہ عوام کی بنائی ہوئی تاریخ ہی ہے۔ جو ملک کو سر بلند کرتی ہے۔ میں ہمیشہ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں جنہوں نے اس طرح سے تاریخ بنائی ہو یا ایسے تاریخی واقعات کے امین ہوں، جس سے ہم اور آپ کچھ سیکھیں۔

آج میرے لیے باعث افتخار ہے کہ میں ایسی شخصیت کے ساتھ ہوں جس نے سمندر کی لہروں کو ناپتے ہوئے وہ سونا نکالا جو نہ صرف اس کے ماتھے کی زینت بنا بلکہ تاریخ میں بھی سنہری سے تاریخ سازی کرتے ہیں غرض کہ ہواؤں میں، فضاؤں کھیل کے میدانوں میں ہر جگہ اپنے کاموں سے تاریخ کی پیشانی کو کشادہ اور روشن تر کر دیتے ہیں۔

آج میں پاکستان کی اُس واحد شخصیت کو خوش آمدید کہتا ہوں جس نے سمندری مہمات کے دوران کٹھن مقابلوں سے وہ اعزازات وصول کیے جس کا شرف آج تک کسی اور پاکستانی کو حاصل نہ ہو سکا۔ اُنہوں نے اور اُن کی بیگم صاحبہ نے نہ صرف کینیڈا میں بلکہ دیگر بین الاقوامی مقابلوں میں بہت سے گولڈ میڈل جیتے، بالخصوص

Scanned with CamScanner

ایشین گیمز(ASIAN GAMES) میں اُنہیں دو مرتبہ گولڈ میڈل جیتنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

بہرام ڈی اواری(BYRAM D. AWARI) صاحب۔ آپ کی تشریف آوری کا بہت شکریہ۔

نعیم طاہر: میں کاغذ دیکھ رہا تھا کہ ماشاءاللہ آپ کو اعلیٰ انتظامی امور میں اس قدر دخل ہے کہ میں پڑھتے پڑھتے حیران رہ گیا۔ اوہو، میں تو بھول ہی گیا کہ تعلیم کے علاوہ آپ کو موسیقی اور خصوصاً وائلن بجانے میں آپ کو خاص مہارت حاصل ہے۔

- Senior Certificate from Trinity College
- Diploma from Cornell university in Hotel Management
- Diploma in Bussiness Management
- L.L.B'
- B.COM

واہ واہ!

Then your ownery Council of Canada. And Chairman of Avari Group, Avari Hotel, Avari International, Avari International Agencies, Beach Luxury Hotel, Beach Beauries, Spencer and Companies, Spencer ......

بہرام ڈی اواری: یہ خُدا کی مہربانی ہے اور میں آپ کو بتا دوں کہ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے لیکن یہ سب ان کی دُعا ہے۔ میرے والد کے بچپن میں ہی اُن کی امی (میری دادی) وفات پا گئیں۔ میرے والد دو بھائی تھے۔ میرے دادا کام کرتے تھے۔ تو اُنہوں نے اپنے بچوں کو E ORPHANAG میں رکھا تھا۔ جب ORPHANAGE سے نکلے تو میرے والد گاؤں کے پہلے لڑکے تھے جنہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا پھر انہوں نے بی۔کام(B.COM) کی ڈگری حاصل کی۔ میرے والد مجھ سے کہا کرتے تھے کہ "میں نے موم بتی کی روشنی میں پڑھ کر بی۔کام کا امتحان پاس کیا۔"

کراچی میں میرے والد کو ایک غیر ملکی فرم۔ SUNLIFE INSURANCE COMPANY OF CANADA میں بحیثیت مینیجر 1922ء میں ملازمت مل گئی۔ اپنی شب و روز محنت سے اسی فرم کی ذیلی شاخوں واقع سندھ، بلوچستان، سرحد اور افغانستان کی بھی ذمہ داری سنبھال لی۔ اسی دوران ایک انگریز نے ان کو بمبئی بُلایا اور کہا کہ اواری صاحب: دوسری جگہ

میری ہے اور میں جگہ دوں گا نہیں۔ آپ سوچ لیں آپ کس کاروبار میں جانا چاہتے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: تو انہوں نے اپنی محنت سے 1944ء میں ایک لاکھ روپے میں BRISTOL HOTEL کے نام سے ایک ہوٹل خریدا۔ پچاس ہزار روپے کا قرضہ GRINDLAYS BANK نے دیا۔ اور پچاس ہزار کا قرض دوست نے دیا۔ میرے والدین نے کام کرنا شروع کیا۔ ہم سب بھی ہوٹل کے اندر ہی مقیم رہے۔ پہلے میرے والد کو کام سِکھایا گیا اور کام سیکھنے کے بعد اُنہوں نے شروع کیا۔ وہ صبح پانچ بجے مارکیٹ جاتے تھے۔ جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تب بھی اُن کے ساتھ صبح پانچ بجے مارکیٹ جاتا تھا۔ یہ جو بچپن سے لے کر آج تک سونے کا چمچ میرے ہاتھ میں نظر آتا ہے یہ تمام آسائش ونشاط میرے والدین کے سبب ہے۔ اُنہوں نے کام کیا، انہوں نے دن رات محنت کی، اُن کی ترقی ہے۔ وہ خود ساختہ (SELF MADE MAN) اِنسان ہیں۔ اور مجھے بھی سکھایا گیا کہ ''بیٹا محنت سے ہی کام کرو گے تو ترقی کرو گے، پسینہ بہائے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔''

نعیم طاہر: اچھا یہ بتائیں کہ یہ سب کُچھ جو ہے۔ ماشاءاللہ You Have an Empire, You managinging it اِس پر ہم تفصیل سے بات کریں گے۔ How come that you took to the Sea?

بہرام ڈی اواری: یہ ہوا تھا کہ 1955ء میں ہمارے بچپن کے ایک پارسی فیملی دوست شاپورشو صاحب ملنے آئے اُنہوں نے کہا کہ میں کشتی رانی ریس پر جا رہا ہوں۔

تو میں نے اُنہیں کہا: کشتی رانی کیا؟ ہوا لگتی ہے، کشتی چلتی ہے، اُس میں کیا بڑی بات ہے کہ میں ریس میں جاؤں؟

اُنہوں نے بولا چلو بیٹا کل آؤ۔

میں گیا اُن کے ساتھ۔ اُس دِن سے آج تک۔

وہ کہتے ہیں نہ کہ شیر نے خون چکھ لیا۔ یوں سمجھیے کہ میں نے وہ سمندر کا خون چکھ لیا، کشتی رانی کا خون چکھ لیا، جواب چھوڑ نہیں سکتا ہوں۔

آپ کو میں بتاؤں کہ اب بھی مجھے ہفتے کہ کسی روز بھی LEXOTANIL کیا کسی بھی گولی کی

ضرورت نہیں ہوتی۔ بس دریا پر ریس ہو جائے، ہفتہ میں ایک بار ہی ہو جائے تو میں تروتازہ ہو جاتا ہوں اور تیار ہو جاتا ہوں پھر سے کام شروع کرنے کے لیے۔

نعیم طاہر: لیکن How did you learn this?۔ آپ نے شروع کیسے کیا؟

بہرام ڈی اواری: سب سے پہلے میں نے شاپورشو کے ساتھ آہستہ آہستہ تفریحی جہازی سفر (CRUISE) کا آغاز کیا۔ میں سب سے کم عُمر پاکستانی نوجوان تھا جو کشتی رانی کرتا تھا۔

جب میں نے باقاعدہ طور پر کشتی رانی کے مقابلوں میں حِصہ لینا شروع کیا تو وہاں سب کھلاڑی انگریز تھے۔ تو وہ قبول نہیں کر سکتے تھے کہ ایک پاکستانی لڑکا، کالا آدمی، ہم جہاں بھی جائیں تو مسکین ہوتے ہیں۔

جب بھی میں اس مقابلے میں آگے نکل رہا ہوتا تھا تو مجھے ہر وقت اس کا احتجاج کرنا پڑتا تھا اور مجھے اس احتجاج میں ہمیشہ ہرایا جاتا۔ کیونکہ کشتی رانی ایک ایسا واحد کھیل ہے جس میں ریفری نہیں ہوتا۔ آپ کھیل رہے ہیں اور اگر آپ غلطی پر ہیں تو مخالف کھلاڑی احتجاج کرتا ہے۔ تو میں اپنا احتجاج ہر وقت ہار جاتا تھا۔ (Hearing) یا مقدمے کی پیشی کا منصف General Suprintendence Company کا سربراہ Rasa Sejati تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور بولا کہ اپنے والد صاحب سے کہو کہ تمھیں ولایت سے Mr. Sambrook Sturgess کی کتاب منگوادیں۔ یہ کتاب تم پڑھو تو کشتی رانی کے کھیل کے اصول وضوابط کے حوالے سے تمہاری معلومات میں بہت اضافہ ہوگا۔ پھر میں نے اپنے والد صاحب سے کتاب منگوانے کی فرمائش کی۔ تو اُنہوں نے فوراً بیرونِ ملک میرے چچا سے بات کرنے کے لیے Trunk Call کی بکُنگ کروائی کیونکہ اس زمانے میں ٹرنک کال Book کروائی جاتی تھی۔ تین گھنٹے کے بعد جب فون آیا تو والد صاحب نے میرے چچا کو یہ کتاب جلد از جلد پاکستان بھیجنے کی تاکید کی۔ تین، چار ماہ کے عرصہ میں کتاب مجھ تک پہنچی۔ میں نے کتاب پڑھی اور اس کے فوری بعد کشتی رانی کے مقابلوں کا سِلسلہ پھر سے شروع کیا۔

Car Float Race ہوئی تو ایک، دو، تین میں ہر ریس جیتتا چلا گیا۔ میری یکے بعد دیگرے کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے انگریز نے بھی احتجاج کرنا چھوڑ دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری اس کھیل میں دلچسپی بڑھتی چلے گئی۔

1957ء میں، مَیں کراچی کی جانب سے کوپن ہیگن (Copenhagen) گیا اور وہاں Hellerup Sailing Club میں نے پہلی بار ٹرافی جیتی۔ ٹرافی جیتنے کا یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ ہر نئی آنے والی صبح مجھے نت نئی کامیابی کی نوید سُنانے کے ساتھ ساتھ میرے اندر ایک نیا جوش و جذبہ ابھارتی گئی۔ University of York Boat Club کی جانب سے میں سری لنکا گیا وہاں انڈیا کا بھی وفد (Delegation) آیا ہوا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا! بہرام ڈی اواری:

وہاں انڈیا کا وفد آیا ہوا تھا۔ جب کشتی رانی ریس شروع ہوئی تو میں پہلی دو ریس میں آگے نکل گیا اور انڈیا کا نیوی کمانڈر Surinder Mongia پیچھے رہ گیا۔ اُن کی داڑھی بھی تھی۔

نعیم طاہر: اچھا داڑھی تھی اُن کی۔

بہرام ڈی اواری: جی ان کی داڑھی تھی۔ سب سے دلچسپ بات یہ کہ تیسری ریس سے پہلے انڈین وفد کے ہر شخص نے انفرادی طور پر مجھے کہا کہ:

اوہو! تم کیسے آگے جا سکتے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ Surinder Mongia دُنیا کا سب سے بڑا کشتی بان (Sailor) ہے۔ لوگ تو اس کے قریب سے گُزرنے کی بھی ہمت نہیں کرتے۔

آپ یقین مانیں جب تیسری ریس میں Surinder Mongia میرے قریب آیا تو میرے ہاتھ کانپنے لگے۔

میرے عملہ (Crew) نے مجھے کہا کہ کیا کر رہے ہو؟ تُمھیں پتہ نہیں؟

اور میں ریس ہار گیا۔

کشتی رانی ریس کے تین مقابلے تھے اور تین ٹرافیاں (Trophies) تھیں۔ اور میں تینوں مقابلے ہار گیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ سوچ کر مجھے نیند ہی نہیں آتی تھی کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟ میں تو اس کھیل میں ہمیشہ عُمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ یہ بات دِل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی اور کُچھ کر دکھانے کی تمنا نے مجھے بے چین کیے رکھا۔

نعیم طاہر: ہاں۔

بہرام ڈی اواری: 1978ء میں South Asia Yachting Regattas کی جانب سے ہانگ کانگ تا

عمان سات مُلکوں میں گیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: اور خاص طور پر میں نے انڈیا کے کھلاڑیوں کو بُلایا اور اُن کے سامنے ریس کی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: خُدا ہمارے لیے جو کُچھ بھی کرتا ہے ہماری بھلائی کے لیے ہی کرتا ہے۔ خُدا کا ہر کام ہمارے لیے مصلحت آمیز ہوتا ہے۔ میں وہ ریس بھی ہار گیا۔

نعیم طاہر: وہ بھی ہار گئے۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔۔

بہرام ڈی اواری: اب میں ہر ریس ہارتا چلا گیا اور دوسرے نمبر پر آنے لگا۔ آخری روز جب ہم سب کھانے کی ٹیبل پر اکٹھے ہوئے تو

Surinder Mogia نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ دوبارہ ریس کرنا چاہتا ہوں اور اس مرتبہ بھی میں تمہیں شکست دوں گا۔

نعیم طاہر: یہ Surinder Mongia نے کہا۔

بہرام ڈی اواری: میں نے جواب میں کہا کہ اگلی مرتبہ جس مقام پر بھی ریس ہوگی اگر میں جیت گیا تو تم داڑھی مونڈنا، اور اگر آپ جیت گئے تو میں سر کے بال منڈواؤں گا۔ یوں ہمارے درمیان یہ شرط طے پا گئی۔

1978ء میں تھائی لینڈ میں ایشین گیمز (Asian Games) کا انعقاد ہوا۔ میں نے اپنے خرچ پر ان مقابلوں میں شرکت کی، اور سید واجد علی شاہ صاحب کی بہت مہربانی کہ اُنہوں نے ہمارے وائلڈ کارڈ انٹری پر خود دستخط کیے کیونکہ پاکستان سپورٹس بورڈ کشتی رانی کے کھیل کو تسلیم ہی نہیں کرتا تھا کیونکہ ان کے خیال میں نہ تو یہ گلی ڈنڈا ہے اور نہ ہی پاکستان کا کھیل۔

بہر حال میں نے ASIAN GAMES میں نہ صرف پاکستان کی نمائندگی کی بلکہ پاکستان کے لیے پہلا سونے کا تمغہ جیتا۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔۔۔

بہرام ڈی اواری: پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن (Pakistan Olympic Association) کا کہنا تھا کہ جب تک پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے صدر سید واجد علی شاہ خود اجازت نہیں دیں گے ہم آپ کو

Scanned with CamScanner

وائلڈ کارڈ انٹری جاری نہیں کر سکتے۔ اور سید واجد علی شاہ نے خود اُس پر دستخط کیے تو میں نے Asian Games میں شرکت کی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری:

Canadian National Championship میں سونے کا تمغہ جیتا۔

Youth Sailing world Championship میں دوسرے نمبر پر رہا۔

Us Open Sailing Championship میں بھی دوسرے نمبر پر آیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: سری لنکا میں، مَیں نے اپنی بیوی کے ساتھ TEAM RACE میں سونے کا تمغہ جیتا۔ میری بیوی بھی دو بار پاکستان کی National Sailing Champion رہی۔

نعیم طاہر: واہ، حیرت انگیز بات۔

بہرام ڈی اواری: ہم نے کشتی رانی کی تربیت بھی ساتھ لی تھی۔ 1982ء میں انڈیا میں ہم میاں بیوی نے نہ صرف کشتی رانی کے مقابلے اکٹھے حصہ لیا بلکہ گولڈ میڈل بھی جیتا۔

1982ء میں ہی، میری بیوی نے پاکستانی خواتین کی نمائندگی کرتے ہوئے پہلا سونے کا تمغہ جیتا۔

انتہائی افسوس ناک بات یہ ہے کہ آج تک ہمارے مُلک میں کسی بھی شعبے میں نمایاں کارکردگی دکھانے والی خواتین کو وہ پذیرائی نہیں ملی جن کی وہ حق دار ہیں۔

کشتی رانی کے کھیل میں وہ پہلی خاتون گولڈ میڈلسٹ ہیں مگر آج تک حکومت کی جانب سے اُنہیں کبھی سراہا نہیں گیا مجھے تو اُنہوں نے تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا۔ لیکن ہمارے مُلک میں خواتین کو تو۔۔۔۔۔

نعیم طاہر: یہ بات توجّہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں خواتین کو وہ حقوق حاصل نہیں جو ایک جدید اسلامی جمہوریہ ریاست میں حاصل ہونے چاہیے۔

آپ مجھے یہ بتائیے کہ کشتی رانی کے مقابلے جو آپ نے جیتے، کیا اُن سب میں آپ کی بیگم صاحبہ بھی آپ کے ساتھ شریک تھیں؟

بہرام ڈی اواری: جی بالکل میری بیگم کشتی رانی کے مقابلوں میں میرے ساتھ تھیں۔

کشتی رانی کے کھیل میں عملہ آگے بیٹھتا ہے اور کشتی دان پیچھے بیٹھتا ہے۔ اور یوں عملہ پہلے لائن کراس کرتا ہے اور کشتی دان بعد میں۔

میری بیگم ہمیشہ مجھے کہتی تھی کہ میں دوسرے نمبر پر آیا ہوں اور وہ پہلے نمبر پر۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔۔۔۔

بہرام ڈی اواری: میں پہلے نمبر پر آتی ہوں اور تم دوسرے نمبر پر۔ پھر بھی سب تم کو سلام کرتے ہیں اور مجھے کوئی نہیں پوچھتا۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔۔۔۔ اچھا! مجھے یہ بتائیں کہ کبھی پانی سے آپ کو ڈر بھی لگا۔

بہرام ڈی اواری: جی، مجھے دو بار ڈر لگا۔ پہلی مرتبہ ڈر لگا، جب Corcoran میں کشتی رانی کا مقابلہ کر رہا تھا اور ہَوا کی رفتار 35 سے 30 میل فی گھنٹہ۔ قانونی طور پر کشتی رانی کے مقابلوں کے دوران LIFE VEST پہننا لازمی ہے کیونکہ یہ آپ کو دس گھنٹے تک پانی میں زندہ رکھتی ہے۔

لائف ویسٹ کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کو Buoyancy Aid کہتے ہیں۔ اس کی مدد سے کھلاڑی پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے کہ اتنے میں امدادی ٹیم اس کو مدد کو آپہنچتی ہے۔ ہوا کی رفتار اتنی تیز تھی کہ میری کشتی اُلٹ گئی۔

نعیم طاہر: اُلٹ گئی؟

بہرام ڈی اواری: جی اُلٹ گئی۔ ہم نے کشتی کو سیدھا کیا لیکن وہ پھر سے اُلٹ گئی۔ اس عمل کو بار بار دُہراتے دُہراتے میں تھک گیا۔ اور جب آخری مرتبہ کشتی اُلٹی تو اُس کا پال (SAIL) میرے سر پر گر گیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: اور مجھے سانس لینے میں دُشواری محسوس ہو رہی تھی۔

نعیم طاہر: اوہو!

بہرام ڈی اواری: پھر مجھے ایک بات یاد آئی جب کپڑا گیلا ہو جاتا ہے تو اس میں سے ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے پال کو اپنے منہ سے ہٹایا اور گہری سانسیں لی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

Scanned with CamScanner

بہرام ڈی اواری: آپ یقین مانیں، میں اتنا تھک چکا تھا کہ زیرِ آب بھی تیرنے کی ہمت نہ رہی تھی اور LIFE VEST نے بھی مجھے دریا کی اوپری سطح پر تیرائے رکھا۔

نعیم طاہر: اوہو-----

بہرام ڈی اواری: اس پورے عمل میں ایک بار تو مجھے بہت خوف اور ڈر محسوس ہوا۔ پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ یہ پانی اور ہوا خُدا کے بنائے ہوئے عناصرِ فطرت ہیں اور مجھے ان کا مقابلہ قوت ارادی سے کرنا ہے۔ میرے والد بھی مجھ سے کہا کرتے تھے اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ اُٹھاؤ۔

نعیم طاہر: کشتی کی تو ابھی اور بھی بات ہوگی لیکن کیا آپ کشتی رانی کے علاوہ کسی اور کھیل میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں؟

بہرام ڈی اواری: ہر شخص کسی نہ کسی کھیل میں دلچسپی اور مہارت رکھتا ہے۔
میں گھڑ سوار تو بہت اچھا تھا لیکن پولو نہیں کھیل سکتا تھا۔ گیند کے ساتھ میری دوستی نہ ہو سکی، جس کی وجہ سے میں ٹینس، ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کی جانب کبھی راغب نہ ہوا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: لیکن سمندر میرا عشق ہے اور اس سے وابستہ تمام کھیل میرے محبوب ہیں۔ میں نے Rowing کے مقابلوں میں پچاس ٹرافیاں جیتی ہیں۔ Water Skiing Club میں شمولیت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ Diving، تیراکی (Swimming) اور Water Skiing کے مقابلوں میں بھی حصہ لیا۔

نعیم طاہر: اچھا! اب کچھ ہمیں کشتی رانی کے متعلق بتایئے اس کے آپ ماہر ہیں۔ کشتی تو کئی اقسام کی ہوتی ہے۔ میں بھی کشتی چلاتا رہا ہوں، ایک زمانے میں Rowing بھی کی ہے۔ Motor Boat اور Pedal Boat بھی چلائی۔ لیکن یہ کس قسم کی کشتی ہے کہ جس کے بادبان ہوتے ہیں؟

بہرام ڈی اواری: کشتی رانی میں دو بادبان ہوتے ہیں۔ آگے کا بادبان JIB یا تکونی بادبان کہلاتا ہے۔ اس کا کام جہاز کو ایک رُخ سے دوسرے رُخ پر لانا ہے، پیچھے کا بادبان بڑا ہوتا ہے۔ اُس کو MAIN SAIL یا HEAD SAIL بھی کہتے ہیں۔ اس کا کام ہوا بھرنے کے ساتھ ساتھ کشتی کی رفتار کو کم یا زیادہ کرتا ہے۔
کشتی رانی کے نیچے ایک چپوار (Rudder) بھی ہوتا ہے جو کشتی کا رُخ پھیرتا یا موڑتا ہے۔ یہ کشتی

کے سرے پر لگا ہوتا ہے۔ اس کے نچلے سرے کی دھار جس طرف پھیری جائے اُسی رُخ کشتی مُڑ جاتی ہے۔

نعیم طاہر: اسے کیا بولتے ہیں؟

بہرام ڈی اواری: چپوار (Rudder) بولتے ہیں۔ یہ لکڑی کا ہوتا ہے یا لوہے کا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: اس کا انحصار کشتی پر ہے۔ جیسے میرے بیٹے XERXES کی کشتی میں لوہے کا چپوار ہے کیونکہ اس کی کشتی لوہے کی ہے۔ گذشتہ برس اس نے کوریا کے شہر SEOUL میں ASIAN GAMES میں حصہ لیا۔ IRELAND اور AMSTERDAM میں منعقد بین الاقوامی مقابلوں میں بھی شرکت کی۔ دو ماہ قبل سپین میں ہونے والے YOUTH SAILING WORLD CHAMPIONSHIP میں حصہ لیا۔
میرے دوسرے بیٹے DINSHAW نے دو بار YOUTH SAILING WORLD CHAMPIONSHIP میں شمولیت اختیار کی۔
میرے بیٹے کی کشتی کے تین بادبان ہوتے ہیں اور تیسرا بادبان SPINMAKER کہلاتا ہے، اور یہ پردہ ہوا بھرنے سے پھُول جاتا ہے، لیکن ہماری کشتی میں دو بادبان ہی ہوتے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: کشتی رانی ایک روحانی فن ہے، کیونکہ یہ ہمیں فطرت کے قریب لے جاتا ہے۔ ہم سورج، ہوا اور سمندر کے مزاج کی نشانیوں کو پڑھنا سیکھتے ہیں۔ ہم اپنی فکروں سے منقطع اور فطرت سے رابطے میں آجاتے ہیں۔
کشتی رانی سمندری لہروں سے ٹکراتی اور بل کھاتی ہوئی اپنا سفر طے کرتی ہے لیکن ساتھ ہی اسے ہمیشہ ہوا کی رفتار سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور یہ آسان کام نہیں ہے۔ سمندری ہوائیں مستقل مزاج نہیں ہوتیں، ہر گھڑی ہوا کا مزاج تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس پل گرم تو اگلے ہی لمحے سرد۔ یہ محسوسات کا کھیل ہے۔ کبھی ہوا ہمارے گال ہولے سے تھپکاتی ہے تو کبھی کان میں سرگوشی کرتے ہوئے گزرتی ہے۔ مختصراً یہ کہ ہمیں ہوا کے جذبات کا مکمل ادراک (Perception) ہونا چاہیے۔

نعیم طاہر: اس کا مطلب ہے معلومات، مشاہدات، محسوسات و مدرکات کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا اتنے ہی نتائج نشاط انگیز ہوں گے۔

بہرام ڈی اواری: جی۔

نعیم طاہر: آپ مجھے یہ بتایئے کشتی رانی میں آپ کی بیگم صاحبہ آپ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ آپ دونوں آپس میں کیا سازباز کرتے ہیں؟ بحیثیت کشتی ران آپ دونوں کا انفرادی طور پر کیا کردار ہے؟

بہرام ڈی اواری: ہم دونوں بحیثیت مجموعی ایک ٹیم کی طرح کام کرتے ہیں۔

نعیم طاہر: ہاں۔

بہرام ڈی اواری: ہمیں ٹیم ورک سکھایا جاتا ہے۔ ٹیم ورک میں کسی سے بھی غلطی سرزد ہوسکتی ہے تو ایسی صورتحال میں شکوہ وشکایت نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ایک دوسرے کی مدد کرنے پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ٹیم ورک اتفاق رائے سے ہی ممکن ہے۔

وہ آگے تکونی بادبان (JIB) کی نگرانی کرتی ہے۔

نعیم طاہر: ان کا کام کشتی رانی کا رُخ متعین کرنا ہے۔

بہرام ڈی اواری: پیچھے والا بادبان HEAD SAIL بڑا ہوتا ہے۔ اس کو میں نے استادہ کیا۔

نعیم طاہر: پہلے وہ اپنا بادبان نصب کرتی ہیں پھر آپ اس کے مطابق اپنے بادبان کی ترتیب دیتے ہیں۔

بہرام ڈی اواری: جی، میں اپنا بادبان اس کے مطابق ترتیب دیتا ہوں۔ سب سے اہم کام کشتی کا توازن برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ ہوا کی رفتار کے مطابق بادبان کو صحیح سمت پر اِستادہ کرنا ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: میری ذمہ داری پیشِ منظر دیکھنا ہے اور عقبی منظر کا وہ خیال رکھتی ہیں۔

نعیم طاہر: CAN YOU HEAR EACH OTHER?

بہرام ڈی اواری: تیرہ فٹ دو انچ کی کشتی ہوتی ہے اور ہم چھ انچ کے فاصلے پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہر وقت گپ شپ رہتی ہے۔

نعیم طاہر: آپ کی بیگم صاحبہ ساتھ ہی کام کرتی ہیں؟

بہرام ڈی اواری: جی بالکل، کئی مرتبہ جب اُس کو مدد کی ضرورت ہو تو میں اُس کی بادبان کی رسی کھینچ لیتا ہوں اور جب مجھے اعانت درکار ہو تو وہ رسی پکڑ لیتی ہے، کیونکہ بادبان کا صحیح سمت پر اِستادہ کرنا ضروری

ہے۔ جس طرح سے وائلن اور ستار کی دیکھ بھال کی جاتی ہے اسی طرح کشتی رانی کا دروبست بھی اس کا لازمی جُزو ہے۔

نعیم طاہر: بہت اچھی بات کی آپ نے۔

بہرام ڈی اواری: اب ہماری قابلیت کا امتحان ہے کہ کتنی مہارت سے رسی کو صحیح سمت کا تعین FOOT کب کستے ہیں۔ ان تکنیکی کاموں کو سلیقے سے اسی وقت ہی کیا جاسکتا ہے اگر کشتی رانی پر عبور ہو۔

نعیم طاہر: سمندر کی لہروں میں جو اُتار چڑھاؤ آتے ہیں، کبھی سیدھا، سکون سے چلتی رہتی ہے، کبھی اتنی بھرپور کہ زناٹے سے اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو روندتی چلی جاتی ہے۔

آپ اُن لہروں کو کیسے مغلوب کرتے ہیں؟

بہرام ڈی اواری: اس کا بھی ایک خاص طریق کار ہے۔ سمندر میں طغیانی کے باعث چھوٹی لہریں زیادہ ہوتی ہیں اسے Choppy Water بھی کہتے ہیں۔ کشتی کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ہم ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں، کیونکہ اگر میری بیوی زیادہ آگے بیٹھ جائے اور میں زیادہ پیچھے بیٹھ جاؤں تو اس صورت حال میں کشتی ڈوبے گی تو نہیں لیکن اس کی رفتار میں کمی واقع ہوجائے گی۔

اس کے برعکس تند و تیز لہروں کی صورت میں ہم دونوں کشتی کے پچھلے حصے میں بیٹھ جاتے ہیں تاکہ کشتی بالائی کنارہ کا رُخ اُونچائی کی جانب ہو اور ہماری کشتی MOTOR BOAT کی مانند آگے بڑھے۔

نعیم طاہر: کیا سید واجد علی شاہ کے وائلڈ کارڈ انٹری کے دستخط کرنے سے پہلے آپ نے کبھی سرکاری خرچے پر کشتی رانی مقابلوں میں حصہ لیا؟

بہرام ڈی اواری: میں KARACHI YACHT CLUB کی جانب سے 1978ء تک نجی خرچے پر مقابلوں میں شرکت کرتا رہا۔ اس کے بعد ہمیں ایک شناخت ملی، اور 1982ء میں پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے صدر سید واجد علی شاہ کے خُود دستخط کرنے پر ہم نے ASIAN GAMES میں شرکت کی۔

نعیم طاہر: ماشاءاللہ، نہ صرف بین الاقوامی سطح پر آپ نے سمندر کے پانیوں میں جیت کے جھنڈے گاڑے بلکہ اپنی کارکردگی اور صلاحیت سے اس کھیل کو حکومت پاکستان سے تسلیم بھی کروایا۔

آپ پاکستان کا فخر ہیں۔ کشتی رانی کھیل میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی قابلیت سے

دنیا بھر میں نہ صرف پاکستان کا نام روشن کیا بلکہ پاکستانی پرچم کی عظمت، تکریم اور وقار میں بھی اضافہ کیا۔

آئندہ بھی جیت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا؟

بہرام ڈی اواری: نہیں؟

نعیم طاہر: نہیں؟

بہرام ڈی اواری: اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر پُرانی نسل کے افراد نئے زمانے کے تقاضوں کو نہ سمجھیں تو اس وقت ہی نئی نسل اور پُرانی میں بُعد پیدا ہوگا۔ پُرانی نسل کا ہر انسان جو ایک حساس دل اور شعور رکھتا ہے خواہ اس کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو، اس کی ذمہ داری ہے کہ جب اپنے حصے کی شمع جلا چکے تو آنے والی نسل کے نوجوان کو موقع دیں تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں، جذبوں، توانائیوں اور بلند عزائم سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچائے۔

نعیم طاہر: تو آپ کا خیال ہے کہ باصلاحیت نوجوان اس کھیل میں دلچسپی لے رہے ہیں؟

بہرام ڈی اواری: جی بہت ہیں۔ مختلف شہروں سے ہمارے پاکستانی نوجوان جوش و جذبہ کے ساتھ اس کھیل میں حصہ لے رہے ہیں۔

نعیم طاہر: کیا آپ کے بیٹے بھی ان میں شامل ہیں؟

بہرام ڈی اواری: جی، میرے بیٹے بھی بین الاقوامی سطح پر اس کھیل میں پاکستان کا نام روشن کر رہے ہیں۔

نعیم طاہر: ماشاءاللہ.. You Got a Large Bussiness Setup اور پھیل بھی رہا ہے۔ کیا آپ بھی اپنے کاروبار میں وسعت کے خواہش مند ہیں؟

بہرام ڈی اواری: بات یہ ہے جناب کہ میری کامیابی و ترقی کے پیچھے میرے والدین کا ہاتھ ہے، جس کا میں ثمر پا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد میرے والدین نے خوشی ہو یا غم زندگی کے ہر معاملے میں مجھے حوصلہ بخشا۔

زندگی میں آگے بڑھنے کی تمنا حرکت کی علامت ہے اور حرکت زندگی کا استعارہ ہے۔ میری بھی خواہش ہے کہ میں پاکستان کے اندر چھوٹے چھوٹے 3 سٹار ہوٹل بناؤں۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہم پہلی پاکستانی انٹرنیشنل کمپنی ہیں جنہوں نے اواری انٹرنیشنل ہوٹل (AVARI INTERNATIONAL HOTEL) کی بنیاد رکھی۔

دوبئی اور ٹورنٹو میں ہمارا ہوٹل تو نہیں ہے لیکن ہم نے اُن ملکوں میں نہ صرف پاکستانی پرچم نصب کیا بلکہ اپنے والدین کی تصاویر کو بھی آویزاں کیا۔

نعیم طاہر: بہت اچھی بات ہے۔ یہ تو ہوئی ہوٹل کی باتیں۔ اب کچھ آپ کی شخصیت کے بارے میں بھی بات ہو جائے۔ کیا آپ کو غصہ آتا ہے؟

بہرام ڈی اواری: دیکھیں میں آپ کو بتاؤں، جس طرح موسم بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی سورج کی تپش، کبھی سیاہ بادلوں کی وجہ سے ٹھنڈی ہوائیں، کبھی ژالہ باری، کبھی شدید سرد موسم۔ اسی طرح دل کا موسم بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے، اور یہ گرد و پیش میں ہر چیز پر اثر انداز بھی ہوتا ہے، دل بھی، کبھی ہنستا ہے، کبھی روتا ہے۔ لیکن دل میں جو ناراضگی ہے وہ سب کہہ دیتا ہوں اس کے بعد خفگی ختم۔ ہمیں اپنی نیت صاف اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رکھنی چاہیے۔

نعیم طاہر: ہاہاہا--- ہاہا ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ غصہ آنا فطری عمل ہے یہ ایک انسانی جذبہ ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔

ابھی آپ کا میں ایک انٹرویو پڑھ رہا تھا۔ اُس انٹرویو میں بھی آپ پارسی قوم کی بہت حمایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا:

Despite these substantial contributions, however you have a controversial reputation in the Parsi Community and your fair share of critics in the words of community member you give up as good as you get return a slap with a slap. would you like to comment?

آپ نے اس کے جواب میں کہا: I give back two slaps. ---کیا حقیقتاً آپ نے ایسا کیا؟

بہرام ڈی اواری: جناب بات یہ ہے کہ میرے والد صاحب کا انتقال 86 برس کی عُمر میں ہوا تھا۔ میرے والد صاحب میرے بہترین دوست بھی تھے۔

نعیم طاہر: آپ فرمانبردار بیٹے ہیں۔

بہرام ڈی اواری: جی شکریہ۔ نہ صرف میں، بلکہ میرے بچے اور میرے دوست بھی اُن کے قریبی دوست تھے۔ ان کے پاس ایک خاص مقناطیسی قوت تھی کہ پہلی ملاقات میں ہی لوگ ان کے گرویدہ

Scanned with CamScanner

ہوجاتے تھے۔ انہوں نے مجھے زندگی کہ کچھ اسباق سکھائے پہلا یہ کہ" بیٹا یاد رکھو اگر کوئی شخص زندگی میں آپ کی مدد کرے تو اپنے محسن کو ہمیشہ بھلائی کے ساتھ یاد رکھو"۔ دوسرا کہتے تھے کہ بیٹا! یاد رکھو، دوستی اور عزت سَر کے بال کی طرح ہے اگر ایک بار اُکھڑ جائے تو دوبارہ استوار نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے ایک بار آئینہ میں شِگاف پڑ جائے تو اُسے پُر نہیں کیا جاسکتا۔ وفا، دیانت، خلوص، سچائی، محنت، ہمدردی اور خِدمت جیسی خوبیوں کو اپنے دِل میں سمولو گے تو رات کو تکیہ پر سَر رکھتے ہی نیند آجائے گی اور زندگی بھر کسی بھی قسم کی خواب آور دوائی کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

1988ء میں جب اُن کا انتقال ہوا تو اُس وقت وہ پارسی قوم کے صدر تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: میں بھی چار بار بلامقابلہ الیکشن جیت کر پارسی قوم کا صدر رہا ہوں۔ دیکھیں، جب آپ ایک بار وزیراعظم، صدر یا لیڈر منتخب ہوجائیں تو آپ کا فرض ہے کہ قوم کے فائدے کے لیے کام کریں۔

نعیم طاہر: ٹھیک ہے۔

بہرام ڈی اواری: پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ پارسی قوم میں تقریباً سب لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ مجھے مخالفین کی اختلاف رائے کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرے حریف کام میں رُکاوٹ ڈالنے کی بھی کوشش کرتے ہیں لیکن مجھے ان سب باتوں کو پسِ پُشت ڈال کر اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کام جاری رکھنا ہے۔ ننانوے فیصد غریب لوگوں نے ایک اعتماد کے ساتھ مجھے منتخب کیا ہے۔ صِرف ایک فیصد امیر طبقہ اپنی ہٹ دھرمی میں میرا ساتھ نہیں دیتا۔

نعیم طاہر: کوئی بات نہیں۔

بہرام ڈی اواری: اِس سب مخالف کے باوجود میں کوشش کرتا ہوں کہ میرے سنگ چلو بھلے خلاف رہو لیکن قوم کے فائدے کے لیے میرے ساتھ مِل جُل کر کام کرو۔

نعیم طاہر: اچھا، مجھے یہ بتائیں کہ آپ ایک منتخب رہنما ہیں، کبھی فیصلہ کرتے ہوئے کوئی مسئلہ درپیش آیا؟ مثال کے طور پر آپ A میں دلچسپی رکھتے ہیں جبکہ قوم کا فیصلہ B کے حق میں ہے ایسی صورتحال میں آپ کیا کرتے ہیں؟ اگر چہ فیصلہ A لینے سے آپ کی شہرت کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے؟

بہرام ڈی اواری: اپنی شہرت کی کمی یا زیادتی سے میری ذات کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا ہر فیصلہ قوم کی منفعت کے لیے نتائج آنے پر سب لوگ مسرُور بھی ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ کو ذکر ہے کہ میں ہیلتھ کلچر انسٹی ٹیوٹ HEALTH CULTURE INSTITUTE کا صدر تھا۔ کمیٹی کے تمام رُکن میرے فیصلے کے خلاف تھے۔ میں نے کمیٹی سے کہا اگر آپ متفق نہیں ہونگے تو یہ میرا استعفیٰ ہے۔ میں نے خوشی خوشی استعفیٰ میز پر رکھا اور کمیٹی سے کہا کہ استعفیٰ دینے کی وجہ کو ضرور قلم بند کرلینا اور چلا گیا۔

فارسی کی کہاوت ہے کہ دو لکڑیاں دہکائیں تو آنکھوں میں دُھواں جاتا ہے، دو قرابت دار بٹھائیں تو دل میں غبار آتا ہے۔ ایسے ہی معمولاتِ زندگی رواں دواں رہتے ہیں۔

نعیم طاہر: آپ سیاست میں کیسے آئے؟

بہرام ڈی اواری: سب سے پہلے مجھے ضیاء الحق نے مجلسِ شوریٰ کے لیے منتخب کیا۔ مجھے ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم الیکشن کے لیے کاغذات جمع کراؤ۔ لیکن میری بیگم کو میرا سیاست میں آنا انتہائی ناپسند تھا۔ میں نے کاغذات نامزدگی جمع کروانے سے پہلے ایک اور پارسی Minocher Bandara (یہ Minoo کے نام سے مشہور تھا) سے رابطہ کیا۔

نعیم طاہر: میں جانتا ہوں Minocher Bandara کو۔

بہرام ڈی اواری: میں نے Minoo سے کہا کہ اگر تم الیکشن کے لیے کاغذات نامزدگی جمع کرواتے ہو تو میں نہیں کراؤں گا، اُس کے انکار کرنے پر میں نے کاغذات الیکشن کمیشن کے دفتر جمع کروادیے۔

ایک ہفتے بعد مجھے معلوم ہوا کہ Minoo نے بھی مسیحی برادری کے کہنے پر کاغذات جمع کروادیے ہیں۔

اُس زمانے میں پارسی، بہائیت، بدھ مت، کالاش اور سِکھ قوم کا ایک ووٹ ہوتا تھا۔

میں نے الیکشن لڑا، لیکن چودہ یا اٹھارہ ووٹوں سے ہار گیا۔

نعیم طاہر: Minoo جیت گیا؟

بہرام ڈی اواری: جی! Minoo جیت گیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: میرے والد صاحب نے کہا کہ بیٹا! میں نہیں چاہتا کہ تُم ووٹوں کی دوبارہ گنتی کے لیے

درخواست دو، بلکہ آئندہ آنے والے الیکشن کے لیے ابھی سے تیاری شروع کردو۔
ایک ہفتے بعد میرے والد صاحب نے مجھے صُبح پانچ بجے فون کیا اور کہا کہ الیکشن کی تیاری کا کیا کِیا؟ میں نے کہا! ابھی تو منتخب نمائندوں نے حلف بھی نہیں اُٹھایا۔ وہ بولے، تو اپنی تیاری آج سے شروع کردو۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔۔۔

بہرام ڈی اواری: اس الیکشن میں ایک نشست پر پانچ امیدوار مدِ مقابل تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

بہرام ڈی اواری: میں نے واضح برتری سے یہ الیکشن جیت لیا۔ بلکہ آئندہ آنے والا الیکشن بھی جیت لیا۔ "شہریت (ترمیم) قانون" کی مدد سے میں نے اپنی قوم کو بہت فائدہ دیا۔
ہمارے دو پارسی سکول انگلش میڈیم ہیں۔

BAI VIRBAIJI SOPARIVALA PARSI HIGH SCHOOL, KARACHI

THE MAMA PARSI GIRLS SECONDARY SCHOOL, KARACHI

میں نے پاکستان میں سکھوں کے لیے گُردوارے کُھلوائے۔ ٹھٹھہ کے رہائشیوں کو صاف پانی، گندے پانی کی نکاسی کا انتظام، بجلی اور بالخصوص خواتین کے لیے بیت الخلاء جیسی سہولیات فراہم کیں۔

نعیم طاہر: یہ بتائیں کہ سیاست میں کبھی اپنے ذاتی مفاد کو بھی ترجیح دی؟

بہرام ڈی اواری: میں نے ذاتی مفاد کے لیے کبھی بھی سیاست کو اپنا ہتھیار نہیں بنایا۔ سیاست سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد ہی میں نے اپنے کاروبار کو چار گُناہ زیادہ وسعت دی۔

نعیم طاہر: آپکو تین بار لائسنس ملا لیکن آپ نے استعمال نہیں کیا؟ وہ کیا قصہ ہے۔

بہرام ڈی اواری: قصہ یہ ہے کہ مجھے تین بار لائسنس تو مِلا لیکن اُس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ اُس کو کام میں لایا جا سکتا۔ دیکھو! مجھے اپنے کاروبار سے وہ خوشی نہیں ملتی جو اپنی قوم کی خدمت کرنے سے دلی سکون ملتا ہے۔

نعیم: آپ کی انڈسٹری کا تعلق سیاحت سے بھی ہے۔ پاکستان میں شعبہ سیاحت کے حوالے سے کافی مسائل ہیں۔ آپ کے خیال میں پاکستان میں سیاحت کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔

بہرام ڈی اواری: آپ کو معلوم ہے۔ دوبئی میں ہر سال اسّی لاکھ سیاح سیر و سیاحت کے لیے جاتے ہیں۔

نعیم: یہ بہت بڑی تعداد ہے۔

بہرام ڈی اواری: میں تو کہتا ہوں کہ پاکستان میں ایک سال میں ایک لاکھ سیاح بھی نہیں آتے، اور جو آتے ہیں وہ بھی زیادہ تر وہ پاکستانی ہیں۔ جو بیرونِ ملک مقیم ہیں۔ ہم تو دو کندھے والے ایک سیاح کو دو سیاح لکھ دیتے ہیں۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔۔۔

بہرام ڈی اواری: پاکستان میں سیاحت نہیں ہے۔

نعیم طاہر: ہاں۔

بہرام ڈی اواری: کیونکہ دیکھیں ایک تو سب سے بڑا مسئلہ امن و امان کی صورت حال کا ہے۔ اور اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس صورت حال کے حوالے سے لوگوں کے ذہن میں خدشات پائے جاتے ہیں۔

نعیم طاہر: جی۔ خدشات۔

بہرام ڈی اواری: اس کی سب سے بڑی مثال کراچی ہے۔ آج غیر ملکی سیاح کراچی کی نسبت لاہور کو ترجیح دی۔
ہمارے سمندر میں بہت نایاب مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ مارلن (MARLIN FISH)۔
لوگ اس مچھلی کا شکار کرنے کے لیے MALDIVES, MAURITIUS اور MADAGASCAR جاتے ہیں۔
بلوچستان کے ساحل پر مارلن مچھلی کی جو قسم پائی جاتی ہے وہ دُنیا بھر میں نہیں مِلتی۔ جو ہمارے سمندر میں YELLOW FIN TUNA پایا جاتا ہے۔ آپ یقین مانیں کہ اتنی چھوٹی ایسی پیلے رنگ کی ٹُونا مچھلی جاپان میں چالیس امریکی ڈالر میں بِکتی ہے۔

Scanned with CamScanner

گلابی جھینگا (PINK PRAWN) بھی۔

نعیم طاہر: جی PINK PRAWN بھی۔ اس کے بعد ہمارے پہاڑ دیکھیں۔ ٹیکسلا اور موہن جو ڈارو کی تہذیبیں ہیں۔ پاکستان پر خدا کی بہت مہربانی ہے۔ ہمارے ملک میں فطرت اور کائنات کے سارے رنگ پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے لوگ۔ دُنیا کے کسی بھی مُلک میں چلے جائیں پاکستانی ڈاکٹر، انجینیر، وکیل نظر آئیں گے۔ ہمارے پھل سبزیاں اور ہماری مچھلی سب سے بہترین ہے۔

بہرام ڈی اواری:

نعیم طاہر: اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ سے بہت اچھی بات چیت رہی۔ آپ کی گفتگو سے بہت محظوظ ہوا۔ جی چاہتا ہے اور بھی باتیں کریں لیکن انشاء اللہ کسی اور موقع پر گفتگو کے اس سلسلے کو یہیں سے آگے بڑھائیں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے دُنیا بھر میں اس ملک وقوم کا نام روشن کیا۔

بہرام ڈی اواری: آپ کا بھی بہت شکریہ۔ میں آخر میں انگریزی میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ I am content with what I have میں خوش ہوں جتنا میرے پاس ہے۔ But not content with what I am میں اِس سے بھی زیادہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ کاروبار کے لیے نہیں۔ بلکہ قوم وانسانیت کی فلاح کے لیے۔ کیونکہ ان کی خدمت کے لیے خوشی اور سکون کا باعث ہے۔

نعیم اللہ آپ کو اس میں کامیاب کرے۔

بہرام ڈی اواری: شکریہ۔

☆☆☆

اختتامیہ:

مجھے یقین ہے کہ آپ کے لیے بہرام اواری کی گفتگو سے ایسے نئے پہلو ضرور سامنے آئے ہوں گے جو زندگی میں آپ کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ یتیم خانے سے زندگی کا سفر شروع کرنے والا، اپنے راستے میں آنے والی مُشکلات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، حالات ومسائل کی بھٹی میں کندن بن جانے والا، ایک روز کاروبار کی دُنیا کا بادشاہ بن گیا۔ مزید برآں اُس کے انتہائی اطاعت گزار فرزند نے اپنے والد کی پیروی کرتے ہوئے اس کاروبار کو اپنی شب وروز محنت، لگن، جذبے اور ایمانداری سے اوج فلک تک پہنچا دیا۔ یہی نہیں بلکہ کشتی رانی کے کھیل میں بین الاقوامی سطح پر فتوحات حاصل کرنے کے بعد اپنا اور اپنے ملک کا نام تاریخ میں سُنہرے حروف سے بھی لکھا۔

میری دُعا ہے کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کا یہ سلسلہ جاری رہے۔

انشاء اللہ آپ کے ساتھ پھر ہماری مُلاقات کسی ایسی ہی شخصیات کے ساتھ "اِن کیمرہ" میں ہوگی۔ ہمارے ساتھ رہیے گا۔ بہت بہت شکریہ۔

نعیم طاہر

☆☆☆

ایف ای چوہدری

ابتدائیہ:

ہرلمحہ جوگزررہا ہے وہ ایک تصویر ہے جو کیمرے کی زد میں آ گیا وہ امر ہو گیا۔ جو ذہن میں محفوظ رہا اسے دیکھنے والوں کی زندگی تک کی مدت ملی اور جو کوئی نہ بنایا وہ اگلے سانس کے ساتھ ختم ہو گیا۔ عکسی تصویر کشی (PHOTOGRAPHY) کائنات رنگ و بو کی وہ واحد زبان ہے جسے دُنیا میں بسنے والے تمام لوگ سمجھتے، مانتے اور سراہتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں عکسی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ تصویری صحافت (Photo Journalism) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ اظہار و ترسیل میں بصری ذریعہ سمعی ذریعے سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ الفاظ کے ذریعے اتنی آسانی سے اپنی بات نہیں کہی جا سکتی جتنی آسانی سے تصویروں کی زبانی۔ فارسی کا محاورہ ہے: "شنیدہ کہ بود مانند دیدہ"

کہا جاتا ہے کہ ایک تصویر ایک ہزار الفاظ کا متبادل ہوتی ہے۔ قلم اور کیمرے کا رشتہ بے حد حساس ہوتا ہے۔ دونوں کا استعمال بڑی احتیاط اور تخلیقیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ تصاویر کے انتخاب کے لیے گہری نظر، مہارت

اور تجربے کی ضرورت ہے۔ تصویری صحافت کے شعبے میں بھی مہارت پیدا کرنے کے لیے خود کو وقف کردینے کا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔

آج ہمارے درمیان بھی ایک ایسی شخصیت موجود ہیں۔ اس ملک کے ممتاز، مایہ ناز، ہمہ جہت اور تصویری صحافت میں مہارت تامہ رکھنے والے محترم ایف۔ ای۔ چوہدری صاحب۔

ایف ای چوہدری کا پورا نام فضل الٰہی چوہدری تھا۔ 15 مارچ 1909ء کو پیدا ہوئے۔ آپ، معروف ماہر تعلیم اور پاک فضائیہ کے ریٹائرڈ گروپ کیپٹن سیسل چوہدری کے والد ہیں۔ جنہوں نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں غیر معمولہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

ایف ای چوہدری صاحب صحافتی اور سماجی حلقوں میں ''چاچا چوہدری'' کے نام سے معروف ہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے اہم لمحات کو بھی اپنے کیمرے میں عکس بند کیا۔

1949ء سے 1973ء تک وہ پاکستان ٹائمز سے بھی منسلک رہے جہاں انہیں میاں افتخار الدین، فیض احمد فیض اور مظہر علی خان کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 14 اگست 1986ء کو ایف ای چوہدری صاحب کو حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔

اس کے علاوہ انہیں 1970ء میں ''تمغۂ خدمت'' اور 1992ء میں ''تحریک پاکستان گولڈ میڈل'' بھی عطا کیا گیا۔

میں آج کے اس پروگرام میں اپنے معزز مہمان جناب ایف ای چوہدری کو صدقِ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

گفتگو:

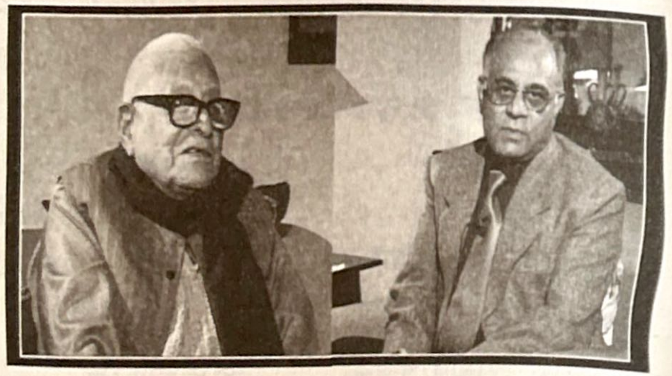

نعیم طاہر: آپ یہ بتائیں کہ آپ نے عکسی تصویر کشی (Photography) کے فن کی ابتداء کیسے کی؟

ایف ای چوہدری: میں 1924ء میں ضلع چکوال کے ایک اسکول The Mission High School میں زیرِ تعلیم تھا۔ ہمارے دار المطالعہ میں ''رہنمائے تعلیم'' کے نام سے اُردو کا ایک رسالہ آیا کرتا تھا۔

نعیم طاہر: جی۔

ایف ای چوہدری: ایک روز اس رسالے میں ایک اشتہار چھپا کہ ایک کیمرا پانچ روپے میں برائے فروخت ہے اور ساتھ ایک فوٹو کھینچنے کا سامان مُفت دیا جائے گا۔ یہ کیمرا اُڑتی ہوئی چڑیوں، چلتی ہوئی ریل گاڑی اور انسانوں کی تصویر بھی کھینچ سکتا ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ یہ پانچ روپے والا کیمرا منگوا کر ہم بھی تصویر کھینچنے کا تجربہ کرتے ہیں۔

نعیم طاہر: جی۔

ایف ای چوہدری: میرے دوست نے کہا کہ یہ پانچ روپے بہت زیادہ ہیں۔ تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟ میں نے کہا کہ دو روپے۔ کیونکہ اس زمانے میں پندرہ روپے ماہانہ جیب خرچ ملا کرتا تھا۔ آخر کار ہم دونوں نے رقم جمع کر کے دو روپے والا پوسٹ کارڈ شنکر داس اینڈ کمپنی برانڈ رتھ روڈ لاہور کے نام لکھا۔

نعیم طاہر: آپ کو پتہ بھی یاد ہے۔

ایف ای چوہدری: جی ہاں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہا۔۔۔

ایف ای چوہدری: ہم نے پوسٹ کارڈ میں لکھا کہ جناب ہم نے آپ کا کیمرا برائے فروخت کا اشتہار دیکھا تھا ہم یہ کیمرا خریدنا چاہتے ہیں برائے مہربانی آپ یہ کیمرا بذریعہ قابلِ ادائیگی ڈاک (Value Payable Post) ارسال کردیں۔

نعیم طاہر: جی۔

ایف ای چوہدری: غالباً کوئی چھ یا سات روپے میں بذریعہ VPP کیمرا ہمیں موصول ہوا۔ جب ہم نے پارسل کھولا تو کیمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی تھا۔ جس میں تصویر کی پرنٹنگ کے حوالے سے تمام ہدایات درج تھیں۔

نعیم طاہر: جی۔

ایف ای چوہدری: ہدایات میں لکھا تھا کہ نمبر ایک مصالحے کو تھوڑے سے پانی میں اور نمبر دو کسی اور مواد میں گھولیں لیکن اس سے پہلے ایک سادہ پانی کی پلیٹ رکھ لیں۔ اس میں ایک خاص نیگیٹو بنانے والی فوٹوگرافی کی پلیٹ کو سفید روشنی میں کھولنا سختی سے منع تھا۔

اس کو صرف لال رنگ کی روشنی میں ہی کھولا جا سکتا تھا۔ اس کی چمک والی اطراف کو زیریں اور دوسری کو بالائی سطح پر رکھیں۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ اب لال رنگ کی روشنی کہاں سے لائیں؟ تو وہ کہنے لگا کہ گڈی کاغذ کو لالٹین کے اردگرد لپیٹ لیتے ہیں۔

نعیم طاہر: لالٹین کے ساتھ۔

ایف ای: لالٹین کے اردگرد لپیٹنے سے بھی روشنی لال رنگ کی ہوجائے گی۔ جب ہم رات کو وہ پلیٹ لگا رہے تھے تو چند بورڈنگ کے لڑکے ہمارے قریب سے گزرے اور استفسار کرنے لگے کہ تم دونوں کیا کر رہے ہو؟ ہم نے کہا فوٹو بنا رہے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ یہ اور لڑکوں نے کہا۔

ایف ای چوہدری: جی۔ ہم نے دی گئی ہدایات کے مطابق سلائیڈ میں فلم ڈالی۔ تصویر کے لیے کیمرے کے دو حصے تھے۔ ایک Instataneuos اور دوسرا "B"۔ 'Instantaneous جلدی سے کھل کر بند ہوجاتا تھا اور "B" بلب کو ظاہر کرتا تھا۔

نعیم طاہر: بس یہی دو حصے تھے۔

ایف ای چوہدری: جی ہاں۔ آجکل تو ہزار، دو ہزار فی سیکنڈ تک کیمرے جاتے ہیں۔

نعیم طاہر: جی۔

ایف ای چوہدری: کیمرا ایک تپائی پر رکھا۔ میرے دوست نے خواہش کا اظہار کیا کہ پہلے اس کی تصویر بنائی جائے۔ اپنے دوست کو دھوپ میں بٹھایا اور پیپل رکھ کر کیمرا کھول دیا۔ وہ کافی دیر تک کھلا رہا اور پھر بند کردیا۔ لال روشنی کے مطابق ہم نے نیگیٹو بنایا۔ ہم نیگیٹو کو نیگاٹو پڑھتے تھے کیونکہ انگریزی زبان سے واقفیت بالکل نہیں تھی۔

نعیم طاہر: نیگاٹو۔

ایف ای چوہدری: اردو میں نیگاٹو لکھا ہوتا ہے۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

ایف ای چوہدری: اب نیگیٹو Self Tonning Paper پر Printing Out Paper کے مرحلے سے گزارتے ہوئے دھوپ یا کم روشنی میں اپنا عکس نمایاں کردیتا ہے۔ اب اس عکس کو مستقل رنگ دینے کے لیے مصالحہ نمبر دو میں اس کو کچھ دیر ہلاتے رہے۔ آخر کار جب میں نے تیار تصویر اپنے دوست کو دکھائی تو اُس نے کہا کہ یہ تو بہت سفید آئی ہے۔ میں نے کہا کہ زیادہ وقت مصالحے میں رکھنے کی وجہ سے سفید ہوئی ہے۔

نعیم طاہر: اچھا زیادہ وقت کی وجہ سے تصویر خراب ہوگئی۔

ایف ای چوہدری: جی پہلی تصویر خراب ہوگئی۔ ہاہاہا۔ اس کے ساتھ اور ہدایات بھی درج تھیں۔ کہ اگر آپ مزید فوٹوگرافی سیکھنا چاہتے ہیں تو ''آئینہ فوٹوگرافی'' آٹھ آنے کی منگوا کر پڑھیں۔

نعیم طاہر: آئینہ فوٹوگرافی۔

ایف ای چوہدری: ہم نے سوچا کہ اس آٹھ آنے والی کتاب کو بھی منگوا کر پڑھ کر دیکھتے ہیں۔ ہمیں اس کتاب سے فوٹوگرافی کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ اس کتاب کے ساتھ یہ ہدایت بھی درج تھی کہ آپ 2B سائز یعنی 6 x 9 cm اور اس کے ساتھ بارہ درجہ یعنی ایک کراس کا پرنٹنگ پیپر کی یہ قیمت ہے۔ فریم مفت ملے گا۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

Scanned with CamScanner

ایف ای چوہدری: ہم نے یہ سارا سامان منگوالیا۔ کتاب پڑھ پڑھ کر ہمیں اس قدر مہارت حاصل ہو چکی تھی کہ ہم نے اچھی تصویر کھینچنی شروع کر دی۔ میرے نویں اور دوسویں جماعت میں سائنس اور فزیالوجی (Physiology) مضامین تھے۔ ہمارے سائنس کے کمرے میں ایک فیلڈ کیمرا تھا۔ ہمارے استاد کالا کپڑا ڈال کر ہمیں کیمرے کے عدسے کی ساخت سمجھاتے تھے کہ اس سے حقیقی و مجازی شبیہہ (Real and Virtual Image) کیسے بنتا ہے۔ اس کی ماسکی لمبائی (Focal Length) کیسے نکالتے ہیں۔

نعیم طاہر: کیا یہ نصاب کا حصہ تھا؟

ایف ای چوہدری: جی ہاں یہ نویں دسویں جماعت کے نصاب میں تھا۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

ایف ای چوہدری: تو پھر وہ موم بتی کی روشنی میں اس کی ماسکی لمبائی (Focal Length) نکالا کرتے تھے۔ کیمروں میں Aperture، Shutter Speed اور ISO کو کنٹرول کرنے کے لیے بٹن موجود ہوتے ہیں۔ ان تینوں کی ترتیب دینے کا مجموعہ Exposure کہلاتا ہے۔ جو تصویر کو روشن یا تاریک (Bright or Dark) کرنے پر منتج ہوتا ہے۔ Aperture جتنا زیادہ کھولا جائے۔ تصویر کا پس منظر اتنا ہی دھندلا ہوگا۔ اور سامنے کا منظر مرکزِ نگاہ ہوگا۔ اگر Aperture چھوٹا ہو جائے تو پسِ منظر اور سامنے کا منظر دونوں ہی مرکزِ نگاہ ہو جائیں گے۔ Shutter Speed کا اہم کام حرکت کرتے منظر کی تصویر کشی بھی ہے۔ اگر حرکت کرتی چیز کی زیادہ روشن تصویر بنانا مقصود ہے تو SHUTTER SPEED بھی کم سے کم رکھنا ہوگی، وگرنہ نتیجہ دھندلی صورت میں ہوگا۔ SHUTTER SPEED اپنے کیمرے کے زوم لینز کے ماسکی لمبائی کے مطابق رکھیں۔

نعیم طاہر: جی ٹھیک۔

ایف ای چوہدری: ایک روز میں نے اپنے استاد سے درخواست کی کہ میں اس کیمرے سے فوٹو کھینچ کے دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیسا آتا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ اچھا! تم نے فوٹو کھینچنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے ایک بار اِن صاحب کی بھی فوٹو کھینچی تھی۔

نعیم طاہر: اچھا اچھا۔

ایف ای چوہدری: میں نے کہا کہ جی سر کوشش کر رہا ہوں۔ پھر کہتے، پڑھائی کون کرے گا میں نے سر آپ فکر نہ کریں، وہ بھی ساتھ ہو رہی ہے۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

ایف ای چوہدری: میں نے اس سے کیمرا لے کر اس میں کوارٹر پلیٹ سائز کا شیشہ ڈالا اور کوارٹر پلیٹ سائز کی فلمیں چکوال سے بھی منگوائی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: اس سے فوٹو گرافی آئے نہ آئے لیکن میں نے سیکھنی شروع کر دی۔ اب جب لڑکے اپنی تصویر کھینچنے کا کہتے تو میں نے کہا، کہ میاں پیسے دو۔ مفت میں نہیں کھینچ سکتا کیونکہ میں اپنا پندرہ روپے ماہانہ جیب خرچ آپ پر نہیں خرچ کر سکتا تو پیسے لے کر میں اُن کی تصویریں کھینچ دیا کرتا تھا۔ پھر میں نے بہت پسند کی، میں نے لڑکوں کو یہ تصویر بارہ بارہ آنے میں بیچی۔ میں نے ایک طرح سے کاروبار شروع کر دیا۔

نعیم طاہر: اچھا! آپ ایک روز مجھے بتا رہے تھے کہ آپ ایک تصویر کھینچ رہے تھے تو آپ کے استاد نے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ پھر اُس نے کہا پہلے میری تصویر کھینچو۔ تو وہ آپ نے چار پائیاں۔۔۔۔۔

ایف ای چوہدری: ہاں چار پائیاں اکٹھی کر کے ڈارک روم بنایا ہوا تھا۔

نعیم طاہر: وہ کیا واقعہ تھا؟

ایف ای چوہدری: وہ واقعہ یہ تھا کہ دن کے وقت روشنی کے باعث ہم تصویر کی پرنٹنگ کے لیے چار پائیاں اکٹھی کر کے، اُن پر کمبل ڈال کر ڈارک روم بنا لیتے تھے۔ لالٹین کے اردگرد لال رنگ کا کاغذ لپیٹ لیتے تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: وہاں پر انہوں نے استفسار کیا تو میں نے کہا کہ ہم فوٹو گرافی کر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی تصویر مجھ سے کھینچوائی اور پھر ڈانٹا کہ یہ کام بند کرو اور اپنی تمام تر توجہ پڑھائی پر دو۔

نعیم طاہر: اچھا۔ تصویر بھی کھینچوالی اور ڈانٹ بھی پڑ گئی۔ ہاہاہاہاہا۔۔۔۔

ایف ای چوہدری: میں نے کہا استادِ محترم۔ ہم روز تو نہیں بناتے، کبھی کبھی شُغل میں بناتے ہیں۔ کہنے لگے کہ شوق کی حد تک ٹھیک ہے لیکن پڑھنے پر دھیان دو۔ میرے سائنس ماسٹر Jockum نے کہا

Scanned with CamScanner

کہ اگر آپ میرے مضمون میں اوّل نمبر پر آئے تو میں آپ کو ایک کیمرا تحفے میں دوں گا۔ ہم نے رٹے لگانے شروع کر دیے۔ اور جب نتیجہ آیا تو چالیس لڑکوں میں، میں پہلے نمبر پر آیا تو چالیس لڑکوں میں، میں پہلے نمبر پر آیا اور مجھے استاد Jockum نے وہ کیمرا دے دیا۔

نعیم طاہر: واہ۔ اچھا۔

ایف ای چوہدری: وہ کیمرا بھی عجیب قسم کا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اسے ضائع کر دیا۔ کیونکہ اس میں SHUTTER SPEED تار کی بجائے ربڑ کے بلب کے آگے لگا ہوا تھا، جو پھونک سے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔۔ یہ تو بڑا۔۔۔

ایف ای چوہدری: میں اب پچھتا رہا ہوں، آج کے دور میں وہ کیمرا نایاب چیز ہوتا۔

نعیم طاہر: اس کے بعد آپ نے۔۔۔

ایف ای چوہدری: پھر FCC کالج گیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ پھر کالج گئے۔

ایف ای چوہدری: مجھے ST. Anthony's College میں نوکری بھی مل گئی۔

نعیم طاہر: یہ نوکری کب ملی؟

ایف ای چوہدری: سال تو مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں لیکن یہ میرے خیال میں 1936ء یا 1931ء کی بات ہے۔ میں تربیت یافتہ استاد تو نہیں تھا لیکن جونیئر کیمبرج کو فزکس اور انگریز لڑکوں کو اُردو سکھاتا تھا۔

نعیم طاہر: St. Anthony سکول کا وہی پرانا کیمپس تھا جو لارنس روڈ پر واقع تھا۔

ایف ای چوہدری: جی بالکل جہاں میرا بیٹا پرنسپل تھا۔

نعیم طاہر: ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔ ہاہاہاہا۔۔۔

ایف ای چوہدری: میرا بیٹا بھی اسی اسکول سے پڑھا ہے اور یہ وہی بیٹا ہے جو پاکستان ایئر فورس میں تھا اور اسے حکومت پاکستان نے ''ستارہ جرأت'' سے بھی نوازا۔

نعیم طاہر: آپ یہ بتائیں کہ تصویری صحافت (News Photography) کا آغاز کیسے کیا۔

ایف ای چوہدری: تصویری صحافت کا آغاز یوں ہوا کہ میں نے سستے داموں پینتس یا چالیس روپے میں کوڈک (KODAK) خرید لیا۔ اس کی رفتار 1/100 فی سیکنڈ تھی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: میں یہ کیمرا لگا نے میکلورڈ روڈ کی جانب رواں دواں تھا کہ راستے میں کوپر روڈ کی کراسنگ کے پاس ایک روپ ڈانسر (Rope Dancer) رسّی کے اوپر دو گھڑے سر پر رکھے ہوئے جا رہا تھا۔ لوگ بھی اس کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی شوق میں اُس کی فوٹو کھینچ لی۔ تصویر کا پرنٹ لینے کے بعد میں نے کہا کہ اس تصویر کو Civil And Military Gazette میں چھپوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

نعیم طاہر: اُس وقت یہاں Civil And Military Gazette ہی واحد انگریزی اخبار تھا، جو یہاں چھپتا تھا۔

ایف ای چوہدری: ہاں ایک ہی اخبار تھا بعد میں PAKISTAN TIMES بھی چھپنے لگ گیا تھا۔ تو میں پرنٹ لے کر چلا گیا۔ اخبار کا ایڈیٹر انگریز تھا۔ ہم نے بھی ہیٹ (HAT) وغیرہ پہنا ہوا تھا۔

میں نے کہا: "May I Come in sir"

اُس نے کہا: Come In۔

میں نے کہا: I Have Brought This Photograph

اُس نے کہا! Oh! yes we will use it.

ہم فوٹو دے کر سکول پڑھنے چلے گئے۔ اگلے روز وہ فوٹو Civil and Military Gazette میں چھپ گئی۔

نعیم طاہر: اخبار میں چھپ گئی۔

ایف ای چوہدری: ہاں ہاں۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ ہماری تصویر اخبار میں چھپ گئی۔ ایک ماہ بعد بذریعہ منی آرڈر تین روپے موصول ہوئے کہ یہ آپ کی تصویر بنانے کی فیس ہے۔ میں بہت خوش ہوا۔ کہ اس میں تو بہت فائدہ ہے دو تین روپے کی بارہ آنے کی فلم آتی تھی اور پانچ روپے میں دس یا بارہ پرنٹنگ پیپرز کا پیکٹ آتا تھا۔ ہم نے تین روپے رکھ لیے اور باقاعدہ اس کام کا آغاز کر دیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: یوں کسی بھی پروگرام کی یا کوئی بھی دلچسپ تصویر بنا کر مختلف اخبارات کو بھیجنے لگا۔ The Express Tribune تین روپے دیتا تھا۔ زمیندار اخبار دو روپے، احسان اخبار بھی تین روپے،

Scanned with
CamScanner

نعیم طاہر: تُرکی ٹوپی۔

ایف ای چوہدری: تُرکی ٹوپی پھوندنے والی اور بغیر پھوندنے والی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: تو قائداعظم نے کہا کہ مجھے مسجد میں جانے کے لیے یہ ٹوپی چاہیے۔ قائداعظم کو کشمیری بازار لے جایا گیا۔ کشمیری بازار میں صرف تین مسلمانوں کی دُوکانیں تھیں جو یہ ٹوپی بناتی تھیں۔ اس دوکان پر قائداعظم نے بغیر پھوندنے والی لال رنگ کی ٹوپی کا انتخاب کیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ کیا قائداعظم نے پہنی؟

ایف ای چوہدری: جی قائداعظم نے وہ ٹوپی پہنی اور یہ خاص تصویر ابھی تک میرے پاس ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ کیا وہ تصویر آپ کے پاس ہے۔

ایف ای چوہدری: جی ہاں۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور میں بھی جوتیاں بغل میں دبائے فوٹو کھینچ رہا تھا۔ تقریب سے پہلے میں نے راج گوپال اور ارجن کو بھی کہا کہ میرے ساتھ چلیں محمد علی جناح نے یہاں تقریر کرنی ہے۔ وہ کہتے نہیں تُو چلا جا اور ہمیں بھی بنا کے دے دینا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: میں نے کہا اچھا بھائی۔ میں ڈرتے ڈرتے جوتی بغل میں دبائے وہاں پہنچ گیا۔ بہت بھیڑ تھی۔ وہاں مولانا ظفر علی خان اور احسان الٰہی ظہیر بھی موجود تھے۔ ایک اور بھاری بھرکم شخصیت بھی موجود تھی مجھے ان کا نام بھول گیا ہے۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ بہت نعرے لگاتے تھے۔

نعیم طاہر: مولانا ظفر علی خان بھی تھے؟

ایف ای چوہدری: جی ہاں مولانا ظفر علی خان نے اپنے پوتے کو بھی گود میں اُٹھایا ہوا تھا۔ ہاہاہاہاہا۔۔۔۔

نعیم طاہر: اچھا۔ اچھا۔

ایف ای چوہدری: جب قائداعظم تقریر کرنے لگے تو پروفیسر عنایت اللہ نے کہا کہ آپ کُرسی پر کھڑے ہو کر خطاب کریں۔ تو قائداعظم نے انگریزی میں جواب دیا، جو میں نے سُنا I FALL DOWN ---

نعیم طاہر: I FALL DOWN۔

ایف ای چوہدری: مسجد کے صحن میں وضو کے لیے حوض بنا ہوا ہے نہ اُس کی مُنڈیر پر قائداعظم نے کھڑے ہو کر

تقریر کی۔

نعیم طاہر: آپ نے قائداعظم کی منڈیر پر کھڑے ہو کر تصویر اُتاری۔

ایف ای چوہدری: جی ہاں وہیں پر اُتاری۔

نعیم طاہر: یہ آپ نے قائداعظم کی پہلی تصویر اُتاری؟

ایف ای چوہدری: یہ قائداعظم کی پہلی امتیازی تصویر تھی۔ کیونکہ اور بھی فوٹوگرافر تصویر بناتے تھے۔ کیونکہ تین روپے بانٹتے ہوتے تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: میں نے اُن کی انگریزی تقریر تو نہیں سُنی۔ لیکن جب پروفیسر صاحب اُن کی تقریر کا ترجمہ کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو قائداعظم نے اُن کو یہ کہہ کر بٹھا دیا کہ میں جب اپنی تقریر مکمل کرلوں پھر آپ ترجمہ کرنا۔

نعیم طاہر: خیالات کا تسلسل نہیں رہتا۔

ایف ای چوہدری: ہماری تو دلچسپی اس میں تھی کہ کون پہلے جا کر اخبارات کو اُن کی تصویر بھجوائے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہاہاہا۔۔۔۔

ایف ای چوہدری: میں نے راج گوپال سے کہا کہ جلدی سے اس تصویر کا پرنٹ بنا دے۔ میں ایک پرنٹ Civil and Military Gazette کو دے دوں گا تم The Express Tribune کو بھجوا دینا اور ایک پرنٹ ارجن کو بھی دے دینا۔

نعیم طاہر: آپ کی کھینچی ہوئی تصویر بھی اخبارات میں چھپ گئی۔ کیا قائداعظم کی تقریر کے بعد حالات کُچھ پُرامن ہوئے؟

ایف ای چوہدری: جی بالکل۔ امن وامان کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ شہید گنج سے متعلق مقدمہ عدالت میں بھی چل رہا تھا۔ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت سے فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوا تو چنانچہ اس فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل کی گئی۔

نعیم طاہر: آپ نے مسلم لیگ ڈھلوال میں کیسے شمولیت اختیار کی؟ اس کا قیام عمل میں کیسے آیا؟

ایف ای چوہدری: قصہ کُچھ یوں ہے۔ ڈھلوال سے تعلق رکھنے والے محمد افضل خان کا تعلق سر سکندر حیات کی سیاسی جماعت یونینسٹ پارٹی (Unionist) سے تھا۔ تو غضنفر علی خان کا تعلق پنڈ دادن خان،

ضلع جہلم سے تھا۔ یہ آپس میں بہت گہرے دوست تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: غضنفر علی خان نے 1937ء کے انتخابات میں محمد افضل خان سے کہا کہ تم اس بار انتخابات میں حصہ نہ لو، ہار جاؤ گے۔ اگلے انتخابات میں، میں تمہاری ہر طرح سے انتخابات جیتنے میں مدد کروں گا۔ اس بات پر دونوں میں شدید اختلاف پیدا ہوگیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: خیر 1937ء کے انتخابات میں محمد افضل خان ہار گئے۔

نعیم طاہر: غضنفر علی خان جیت گئے۔

ایف ای چوہدری: ان انتخابات میں مسلم لیگ کے صرف دو اُمیدوار ہی جیتے تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: 1937ء کے انتخابات جیتنے کے بعد غضنفر علی خان یونینسٹ پارٹی (UNIONIST PARTY) میں شامل ہوکر پارلیمانی سیکرٹری بن گئے۔ اس دور میں مسلم لیگ باقاعدہ جماعت نہ تھی، صرف پرچار ہی ہوتا تھا۔ محمد افضل خان نے کہا کہ مسلم لیگ کا کوئی ٹکٹ نہیں ہے اور یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ میں اب باقاعدہ مسلم لیگ میں شامل ہوں گا۔ وہ کہنے لگے کہ تُو میرے ساتھ چل کر فوٹو کھینچا کر، میں گاؤں گاؤں جا کر مسلم لیگ جماعت کی تشہیر کروں گا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: اُن دنوں پہاڑی علاقے میں باربرداری کے لیے گھوڑوں کی سواری ہوتی تھی۔ کھیوڑہ سے کوئی سولہ میل کی دوری پر تھیلہ، سوکہ وغیرہ جیسے گاؤں میں ہم نے مسلم لیگ کا پرچار شروع کر دیا۔ افضل خان کے کچھ دوست بھی ہمارے ہمراہ ہوتے تھے۔

نعیم طاہر: یوں آپ محمد افضل خان کے ساتھ مل کر مسلم لیگ جماعت کا حصہ بن گئے۔

ایف ای چوہدری: مجھے بھی کبھی کبھار کہتا تھا کہ تُو بھی تقریر کر، میں نے کہا، میں تقریریں نہیں کر سکتا۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔

ایف ای چوہدری: اب فوٹو بنا کر اخباروں میں بھی بھیجنا تھیں۔ گاؤں میں ڈاک خانہ بھی تھا۔ اخباروں کا ری سائز 6x4 انچ ہوتا تھا جسے Cabinet Size کہتے ہیں۔ اب ری سائز بنانے کے لیے ایک

جادوئی لالٹین منگوائی جو کہ کاربائیڈ لیمپ سے جلتی تھی کیونکہ لائٹ تو تھی ہی نہیں۔ جب نیگیٹو ڈال کر دیوار پر Focusing کی تو بڑا اچھا پرنٹ آگیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: پھر میں نے ایک باریک سی تختی لگا کر کیونکہ پلائی وڈ تو دستیاب نہ تھی، سفید کاغذ پر Focusing شروع کی۔ لیکن اس کا سائز 6x4 کی بجائے 6x8 تھا۔ تو میں نے چکوال سے 10x12 کا پیپر منگوا کر پرنٹ نکالے اور پیکٹ بنا کر Civil and Military Gazette اور Illustrated Weekly of India بھیج دیں اور ان اخبارات میں تصویریں چھپتی رہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ جب 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو کیا آپ لاہور میں تھے؟

ایف ای چوہدری: ہاں میں لاہور میں ہی تھا۔

نعیم طاہر: کیا آپ نے فوٹو کھینچی؟

ایف ای چوہدری: میں نے اور راج گوپال نے بہت ساری فوٹو کھینچی۔ مسلم لیگ کے دفتر کے ایک جانب سے پنڈال سجا دیا جاتا تھا اور وہیں قرارداد وغیرہ پاس کر کے شام کو جنرل باڈی میٹنگ میں پیش کی جاتی تھی۔

نعیم طاہر: یہ منٹو پارک ہی کہلاتا تھا۔

ایف ای چوہدری: جی منٹو پارک میں تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: شام میں چاروں اطراف بڑے بڑے برقی قمقمے جگمگا رہے ہوتے تھے۔

نعیم طاہر: یہ کتنے بجے کی بات ہوگی؟ شام کا وقت تھا؟

ایف ای چوہدری: شام کا وقت تھا کیونکہ جنرل باڈی میٹنگ کا انعقاد شام کے وقت ہوتا تھا۔

نعیم طاہر: چوہدری صاحب کیا آپ کے پاس 1940ء میں منعقد آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کا پروگرام بھی ہے؟

ایف ای چوہدری: جی میرے پاس اس پروگرام کا ریکارڈ تھا۔ اس کی بہت خستہ حالت ہوگئی تھی۔ میں نے ریکارڈ کروا کے اپنے پاس رکھ لیا۔

نعیم طاہر: اس پروگرام کی کچھ تفصیل بتائیں۔

Scanned with CamScanner

ایف ای چوہدری: 12 مارچ 1940ء بروز جمعرات پہلے روز کا پروگرام کُچھ یوں درج تھا:

-Arrival at the LAHORE RAILWAY STATION by special train of President Mr. M.A Jinnah. Reception and Procession from the railway station.

یہ سارا پروگرام انگریزی میں تحریر تھا۔

نعیم طاہر: ریلوے اسٹیشن پر محمد علی جناح کا استقبال اور پھر جلوس کے ہمراہ روانگی۔

ایف ای چوہدری: بات یہ تھی کہ اُن دنوں خاک سار تحریک کے المناک واقعے نے ملک کی سیاسی فضا میں ایک زبردست ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اس واقعے میں بہت سارے خاکسار مارے گئے تھے۔ لاہور شہر میں کرفیو نافذ العمل تھا۔ اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی کہ قائداعظم اپنا اجلاس ملتوی کر دیں۔ لیکن وہ اس بات پر مُصر تھے کہ اجلاس 21 تاریخ کو ہی ہوگا۔

نعیم طاہر: قائداعظم اجلاس ملتوی کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

ایف ای چوہدری: کارکنوں نے رات بھر میں منٹو پارک میں ٹینٹ لگائے۔ برقی قمقموں سے جگمگا دیا۔ دوسری جانب سکندر حیات نے شہر میں کرفیو نافذ کر دیا۔

نعیم طاہر: جی۔

ایف ای چوہدری: جب قائداعظم محمد علی جناح اپنے وفد کے ہمراہ تین بجے بذریعہ Frontier Mail لاہور پہنچے۔ استقبالیہ کمیٹی میں سر تین بجے بذریعہ سکندر حیات بھی تھے۔ جب اُنہوں نے قائداعظم کے گلے میں پھول ڈالے تو اُنہوں نے پھول نہیں ڈلوائے، بلکہ اُس سے بات بھی نہ کی۔ کیونکہ قائداعظم سر سکندر حیات سے خفا تھے کہ انہوں نے خاکسار تحریک کے کارکنوں کو مروایا تھا۔

نعیم طاہر: جی۔ ٹھیک۔

ایف ای چوہدری: قائداعظم اپنے وفد کے ہمراہ سیدھا ہسپتال گئے اور خاکسار تحریک کے زخمی کارکنوں کی خیریت دریافت کی۔ اسی وقت ڈھول بجا کر اعلان کیا گیا کہ کرفیو توڑ دیا گیا ہے۔

نعیم طاہر: ڈھول بجا کر ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔

ایف ای چوہدری: جی ڈھول بجا کر بتاتے جاتے تھے کہ کرفیو ختم ہو گیا ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: قائداعظم نے پرچم کشائی کے فوری بعد اپنے خطاب میں مسلم لیگ کے جھنڈے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

T.P.M meeting of the council of All India Muslim League at the Pandal.

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: اب 22 مارچ 1940ء بروز جمعہ کا پروگرام کُچھ یوں تھا:

.10:00 A.M meeting of the working committee of All India Muslim League at the Pandal.

. 2:30 P.M first sitting of Open session of the Pandal.

. Recitation from the Holy Quran.

. National Songs and recitation of poems.

. Nawab Sir Shah Nawaz Khan, the Chairman of the reception committee address and invitation to Mr. M.A Jinnah.

. Presidential address of Mr. M.A Jinnah.

. Anouncement of names of five members nominated by the president for the subject committee.

. Meeting of the subject committee at 08:30 P.M

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای اب 23 مارچ 1940ء بروز ہفتہ کا پروگرام کُچھ یوں ترتیب دیا گیا تھا:

. 10 A.M second sitting of the opening session in the pandal

. Consideration of resolution put forward by the subject committee.

. 03:30 P.M meeting of the subject committee at the pandal.

Scanned with CamScanner

. 08:30 P.M third sitting of the open session at the pandal.

. Consideration of resolution put forward by the subject committee.

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: 24 مارچ 1940ء بروز اتوار کا پروگرام یوں درج تھا:

. 9:00 A.M meeting of the subject committee at pandal.

. 9:30 P.M fourth sitting of the open session at the pandal, consideration of

resolution put to vote by the subject committee.

نعیم طاہر: اچھا یہ 24 مارچ کو Put To Vote ہوا ہے۔

ایف ای چوہدری: 23 مارچ کو قرارداد پیش کی گئی اور 24 مارچ کو یہ منظور ہوئی۔

نعیم طاہر: جنرل باڈی نے پیش کیا۔

ایف ای چوہدری: جی ہاں، اور بیگم محمد علی آخری مقررّہ تھیں۔ تقریباً رات کے دس یا گیارہ بجے وہ قرارداد منظور ہوئی جسے قرارداد لاہور کہا جاتا ہے۔

نعیم طاہر: اسے قرارداد لاہور (Lahore Resolution) کہتے ہیں۔

ایف ای چوہدری: قرار داد لاہور (Lahore Resolution) کے بعد دہلی میں کمیٹی نے اسے قرارداد پاکستان (Pakistan Resolution) کے نام سے منظور ہوا۔

نعیم طاہر: اچھا یہ بتائیں کہ اس سارے واقعے میں آپ نے کس کس موقعے پر تصاویر لیں؟

ایف ای چوہدری: ہم نے بہت زیادہ تصویریں نہیں کھینچی تھیں۔

نعیم طاہر: نہیں کھینچی تھیں؟

ایف ای چوہدری: ایک تصویر بنائی جب پرچم کشائی کے بعد قائداعظم خطاب فرما رہے تھے۔ دوسری تصویر کھینچی جب نیشنل گارڈ والے قائداعظم کو لے کر آ رہے تھے۔ کیونکہ ہماری خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ تصویریں اخبارات میں چھپیں۔ جبکہ اخبارات میں چھپائی کے مراحل بہت وقت لیتے تھے۔ Civil and Military Gazette کا آخری ایڈیشن سات یا ساڑھے سات بجے

شمال میں جاتا تھا۔ آخری ٹرین دس بجے پشاور سے لاہور آتی تھی اس کے بعد کوئی ٹرین صبح کے پانچ بجے تک لاہور نہیں آتی تھی، تو اس کے لیے تصویریں جلدی بنانا پڑتی تھیں۔ The Express Tribune کے ساتھ مقابلہ ہوتا تھا۔

نعیم طاہر: آپ کو تصویر کھینچ کر بھاگنا پڑتا تھا۔

ایف ای چوہدری: سب کو بھاگنا پڑتا تھا۔ سب چاہتے تھے کہ تصویر کو جلد از جلد اخبارات میں بھیجا جائے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ اس کے بعد آپ نے قائداعظم کی تصویریں کھینچی۔

ایف ای چوہدری: قائداعظم اکثر اسلامیہ کالج میں سٹوڈنٹ فیڈریشن سے خطاب کرنے آتے تھے۔ وہاں پر تقریب تقسیم انعامات کی تقریب میں بھی ایک تصویر کھینچی۔ اُن دنوں طالب علموں کو قائداعظم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ انہیں خاص دعوت دے کر بُلاتے۔ باہر پنڈال لگاتے۔ قائداعظم آئے ہیں۔ انہیں بڑی اچھی کرسی پر بنا، سجا کر بٹھایا۔

نعیم طاہر: لڑکوں کو قائداعظم کی تقاریر سُننے کا شوق تھا۔

ایف ای چوہدری: طالب علموں کی وہ بہت عزت کرتے تھے اور اُن کی ہر بات مان لیتے تھے۔ یہاں تک کہ طالب علموں کے ساتھ گراؤنڈ میں زمین پر بیٹھ جاتے۔ میں نے فوٹو کھینچی تھی۔

نعیم طاہر: قائداعظم لڑکوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ جاتے تھے؟

ایف ای چوہدری: سردیوں کا موسم تھا۔ قائداعظم دھوپ میں لڑکوں کے ساتھ زمین پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ساتھ میں پائپ بھی پی رہے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: وہاں پر مجھے قائداعظم کی ایک تصویر بنانے میں پندرہ منٹ لگے کیونکہ میں اسے تصویر میں ان کی شخصیت کے مثبت پہلو منظرِ عام پر لانا چاہتے تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: ان کی آنکھیں بہت پُرکشش تھیں۔ قائداعظم کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کوئی گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ بہت کم مسکراتے تھے، قہقہہ تو تمام عُمر نہیں لگایا۔ میری خواہش تھی کہ کسی طور ایک بار مسکرا دیں تو میری تصویر بن جائے گی۔ کوئی ایسا لمحہ آیا کہ وہ مُسکرا دیے اور میں نے فوری طور پر کیمرا دبا دیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہاہا۔

ایف ای: اُن دنوں 620 میں فوکسنگ کا نظام نہیں تھا اور ہم اندازے ہی تین یا پانچ فٹ کہتے تھے۔ میں نے وہ رکھ کر ان کی تصویر بنائی وہ بڑے اخباروں میں چھپی۔

نعیم طاہر: اُن کی مسکراتی ہوئی تصویر؟

ایف ای چوہدری: جی ہاں۔ مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی کہ میں نے قائداعظم کی مسکراتے ہوئے تصویر بنالی ہے۔

نعیم طاہر: کیا قائداعظم لباس اچھا پہنتے تھے؟

ایف ای چوہدری: میرے خیال سے بہت کم لوگ لباس کے اتنا شوقین ہونگے جتنا کہ قائداعظم لباس کے شوقین تھے۔

ایک بار بچہ لیگ، مسلم لیگ بنی۔ میرے خیال میں مزنگ کے بچے تھے۔ بچوں نے ایک سوا ایک روپیہ چاندی کا جمع کیا۔ ان پیسوں کو ریشم کی تھیلی میں ڈالا اور چاندی کی طشتری بنوائی۔ اس طشتری میں رکھ کر انہوں نے قائداعظم کو پیش کرنا تھا۔ مجھے عزیز کا ٹیلی فون آیا کہ مجھے سیکرٹری کا فون آیا ہے کہ آج بچہ لیگ نے قائداعظم کو وہ پوٹلی پیش کرنی ہے تو فوٹو کھینچنے چلیں۔ میں نے کہا مجھے بھی ساتھ لے جانا میں بھی چلوں گا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: ہم دونوں گئے اور تیسرا فوٹو گرافر وہاں کوئی نہیں تھا، لیکن وہ چھوٹا سا بچہ ہمارے آنے سے پہلے ہی قائداعظم کو تھیلی پیش کر چکا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔اچھا۔

ایف ای چوہدری: ہم نے قائداعظم سے کہا کہ آپ کا بچوں کے ساتھ گروپ فوٹو کھینچنا ہے۔ کہنے لگے Yes, Yes come on take it.

وہ سب کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جس بچے نے قائداعظم کو ایک سوا ایک چاندی کے سکے تھیلی میں پیش کیے گئے تھے۔ عزیز نے کہا کہ سر اسے اپنی گود میں بٹھالیں۔

نعیم طاہر: اچھا گود میں۔

ایف ای چوہدری: قائداعظم نے کہا No, my crease will be spoiled. So, I will put it here.

اس بچے کو ایک طرف بٹھالیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ہاہاہاہا۔۔۔۔

ایف ای چوہدری: بچوں کے ساتھ دلی وابستگی تھی۔ آپ نے دیکھے ہوں گے باکس کیمرا یا براؤنی باکس۔

نعیم طاہر: جی جی وہ بہت چھوٹا سا ہوتا تھا۔

ایف ای چوہدری: بچے کہتے سر ہم نے آپ کے ساتھ ایک فوٹو لینی ہے تو وہ کہتے Come On Take It۔ وہ فوراً کھڑے ہو کر بچوں کے ساتھ تصویر اُتروا لیتے۔ وہ ٹک ٹک کر کے تھینک یو سَر کہہ کر بھاگ جاتے۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

ایف ای چوہدری: وہ بچوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ بچوں کو صاف کپڑے پہننے کی تاکید کرتے اور گندی جگہ پر کھیلنے سے ہمیشہ منع کرتے۔

نعیم طاہر: آپ نے پاکستان ٹائمز میں کب ملازمت کا آغاز کیا؟

ایف ای چوہدری: پاکستان ٹائمز میں باقاعدہ ملازمت کا آغاز پاکستان بننے کے بعد کیا۔ پاکستان ٹائمز پہلی بار 04 فروری 1947ء میں چھپا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ پاکستان ٹائمز کا۔

ایف ای چوہدری: پاکستان بنتے ہی اولے پڑے۔ گورنر صاحب نے ایک نیا قانون نافذ کیا کہ کوئی بھی اخبار پاکستان مسلم لیگ کے جلسوں کی تصاویر پندرہ روز تک نہیں چھاپے گا۔ اس کے بعد تصویریں پُرانی ہو جاتی تھیں۔ اور پندرہ دن کے بعد کون سا اخبار تصویر چھاپے گا۔

نعیم طاہر: پھر فسادات اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تو مہاجرین کی ٹرینیں آتی تھیں کیا آپ نے اُن کی بھی تصویریں لیں؟

ایف ای چوہدری: مہاجرین ریل گاڑیوں پر جوق در جوق آرہے تھے۔ مہاجرین کی ریل گاڑی سے اُترتے ہوئے اور پھر جاتے ہوئے کی بہت سی تصویریں میرے پاس ہیں۔ میرے کچھ نیگیٹو گم ہو گئے اور کچھ میں تصویریں وقتاً فوقتاً کمال حیدر کو بھیجتا رہتا تھا تو وہ پاکستان ٹائمز میں تصویریں چھپتی رہتی تھیں۔ ایک میرے پاس بہت نایاب نیگیٹو تھی وہ معلوم نہیں میرے مددگار نے کس کو دے دی۔ اس تصویر میں ہندو مہاجرین مغلپورہ ریلوے سٹیشن سے مال گاڑی میں بیٹھ کر جا رہے تھے۔ اس تصویر کے گم ہونے کا مجھے بہت افسوس ہوا۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: آپ نے پاکستان ٹائمز میں ملازمت کا آغاز کیسے کیا؟

ایف ای چوہدری: مارچ 1949، میں پاکستان ٹائمز میں باقاعدہ ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔ انہوں نے ضرورت برائے سٹاف فوٹوگرافر کا اشتہار دے رکھا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد میں اور عزیز ہی فوٹوگرافر رہ گئے تھے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے سالانہ کھیلوں کی تقریب تقسیم انعامات بروم ہوسٹل (Broome Hostel) میں منعقد ہو رہی تھی۔ لیاقت علی خان مہمان خصوصی تھے۔ میں نے فوراً سے اس تقریب کی فوٹو کھینچی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: میں نے تقسیم سے پہلے سولہ روپے ماہانہ کرایہ پر میکلوڈ روڈ پر واقع کرپارام بلڈنگ میں اپنا اسٹوڈیو بنالیا تھا۔ نیاز میرا اسسٹنٹ تھا۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

ایف ای چوہدری: میں نے نیاز سے کہا کہ جلد از جلد یہ تصویر پرنٹ کردو۔ پاکستان ٹائمز بھیجنی ہے۔ اگر دیر ہوگئی تو وہ چھاپیں گے نہیں۔ نیاز کہنے لگا میں سپرٹ نہ کردوں؟ میں نے کہا سپرٹ کردو۔ نیگیٹو سپرٹ کرکے اُس کا ایک پرنٹ بنایا۔ میں نے GLAZING مشین پہلے ہی گرم کر رکھی تھی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: میں جب پاکستان ٹائمز کے دفتر گیا تو فیض صاحب نے کہا کہ ابھی تو لیاقت علی خان تقریر کر رہا ہے اور آپ اتنی جلدی تصویر بھی لے آئے، This is your News photography۔ تو کمال حیدر سے کہا کہ جلد از جلد بلاگ میکر کو بھیجو تا کہ تصویر چھپ جائے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ پھر آپ کو فیض صاحب نے پاکستان ٹائمز میں ملازمت کی پیش کش بھی کی؟

ایف ای چوہدری: فیض صاحب نے کہا: I Want You۔ میں نے کہا کہ میں خوش ہوں، پڑھا بھی رہا ہوں۔ ساتھ میرا اسٹوڈیو ہے۔ اللہ اللہ خیر۔ لیکن پھر میں نے اپنی شرائط پر پاکستان ٹائمز میں باقاعدہ ملازمت شروع کردی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ایف ای چوہدری: یہ شرائط وضوابط ابھی تک میرے پاس ہیں۔ جب میں ریٹائر ہوا تھا تو میں نے سب تحریر کیا تھا۔

نعیم طاہر: آپ ریٹائر کب ہوئے؟

ایف ای چوہدری: 1973ء میں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ آپ نے اس کال کوٹھری کی بھی تصویر کھینچی جہاں بھگت سنگھ قید تھا؟

ایف ای چوہدری: جی ہاں۔ جیل روڈ لاہور پر واقع جیل پاکستان کی Central Jail کہلاتی تھی۔ پورے پاکستان سے قیدی یہاں آتے تھے۔ حکومت اس جیل کو گرا کر کوٹ لکھپت منتقل کر رہی تھی۔ لاہور کا ایک بہت بڑا لینڈ مارک تھا۔

مجھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے وہ کال کوٹھری کہ یہاں بھگت سنگھ رات کو ہوتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان اس جگہ پر تھے۔ میں نے وہاں تصویریں کھینچی۔ بھگت سنگھ کی کال کوٹھری پھانسی گھاٹ کے بالکل قریب تھی۔ شادمان کو جانے والی سڑک پر گول چکر کے قریب پھانسی گھاٹ تھا۔ میں نے اس پھانسی گھاٹ کی بھی تصویر بنائی کہ یہاں بھگت سنگھ کو سزائے موت دی گئی تھی۔

نعیم طاہر: آپ نے لاہور کی کون کون سی تاریخی تصویریں اپنے کیمرے میں محفوظ کیں؟

ایف ای چوہدری: لاہور میں اکبری منڈی میں واقع ''اکبری دروازہ'' کو گرا کر سڑک کشادہ کر رہے تھے۔ وہ دروازے گرانے سے پہلے میں نے اس کی تصویر کھینچ لی اور پاکستان ٹائمز میں بھی چھپیں۔

نعیم طاہر: آپ نے ٹیلی ویژن پر بھی تصویری صحافت کو متعارف کروایا؟

ایف ای چوہدری: جی۔ 1964ء میں ٹیلی ویژن پائلٹ (TELEVISION PILOT) اسٹیشن بنا تھا۔ ان کے پاس تصویر کی پرنٹنگ اور ڈیلو پلپنگ کے لیے کوئی DARK ROOM نہیں تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک فوٹوگرافر تھا جو باہر سے تصویر کی پرنٹنگ کروا کر لے آتا تھا تو وہ خبروں میں دکھا دیتے تھے۔

مجھے جنرل میجر آغا بشیر نے بلایا اور کہنے لگا کہ چوہدری صاحب ہمیں 5x4 کا پرنٹ بنا دیا کرو ہم خبروں کے ساتھ وہ دکھا دیا کریں گے۔ ہم ڈھائی روپے دیں گے اور ڈھائی سو روپے Retainer دیں گے۔ میں پرنٹ انہیں بائیسکل پر دینے جاتا تھا تو وہ فوراً اس دِکھا دیتے تھے۔

نعیم طاہر: آپ کا سب سے بڑا کارنامہ کھلاڑی کی کرکٹ کھیلتے ہوئے تصویر کھینچنا ہے۔

ایف ای چوہدری: کھلاڑی کی میدان میں کرکٹ کھیلتے ہوئے تصویر کوئی نہیں کھینچتا تھا۔ فیلڈنگ کرتے یا آؤٹ ہو کے جا رہے ہیں ایسی تصاویر سب کے پاس ہوتی تھیں۔ شاید 1950 یا 1951 میں پہلی بار

ہمارے ملک میں ویسٹ انڈیز بامقابلہ پاکستان کھیلا جا رہا تھا۔میاں سعید ٹیم کے کپتان تھے۔ہم بُری طرح سے ہار رہے تھے۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔

ایف ای چوہدری: میں نے نیاز سے کہا کہ بادشاہی مسجد کی فوٹو کھینچ کے دیکھتے ہیں۔میں فوکسنگ کر کے بادشاہی مسجد کی فوٹو بنائی جب اُس کا پرنٹ لیا تو اس میں بہت روشنی آ گئی۔کیمرے میں کپڑے کا برائٹ شٹر ہوتا ہے۔اس میں بھی سوراخ نہ تھا۔رات کو سوتے ہوئے میرے دماغ میں خیال آیا کہ اگر کالا کاغذ کاٹ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لینز کے قریب چار یا پانچ جگہوں پر لگا دوں تو روشنی تر تیب سے نہیں پھیلے گی۔میں بہت خوش تھا کہ میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

☆☆☆

اختتامیہ:

میں سمجھتا ہوں کہ ایسے درخشندہ ستارے جو ہماری تاریخ کا مُصدق باب ہیں۔ان کا احترام وعزت و وقار ہم سب پر لازم ہے۔

ایف ای چوہدری صاحب کا شمار ان باکمال لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے علم وفن میں یکتا اور نابغہ روزگار شمار ہوتے ہیں۔انہوں نے اپنے ہُنر سے زمانے کی تاریخ کو بدل ڈالا۔میں چوہدری صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ وہ یہاں تشریف لائے اور ہمارے ساتھ اور ناظرین کے گفتگو کی تاریخ کے اہم گوشوں کا احاطہ کیا۔

ایف ای چوہدری صاحب ملاقات کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔آپ کا بہت بہت شکریہ۔

نعیم طاہر

☆☆☆

Scanned with CamScanner

عورت کے ہوتے ہوئے میں نے یہ ٹرافیاں جیتی ہیں، اب آپ لوگوں کی باری ہے"۔

اپنے بیٹوں کی ہمت بڑھانے کا اس سے زیادہ مناسب انداز کچھ اور نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ خاتون "امیر بی" تھیں اور ان کی بات توجہ سے سننے والے بیٹے آنے والے برسوں میں کرکٹ کی دنیا کے مشہور محمد برادران کے طور پر پہچانے گئے۔

اگر کرکٹ کے میدان میں اپنے گزرے ہوئے سنہرے دور کی یاد تازہ کرنے کے لیے آج ہمارے ساتھ اس پروگرام میں شامل ہیں جناب حنیف محمد صاحب۔ میں اُن کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

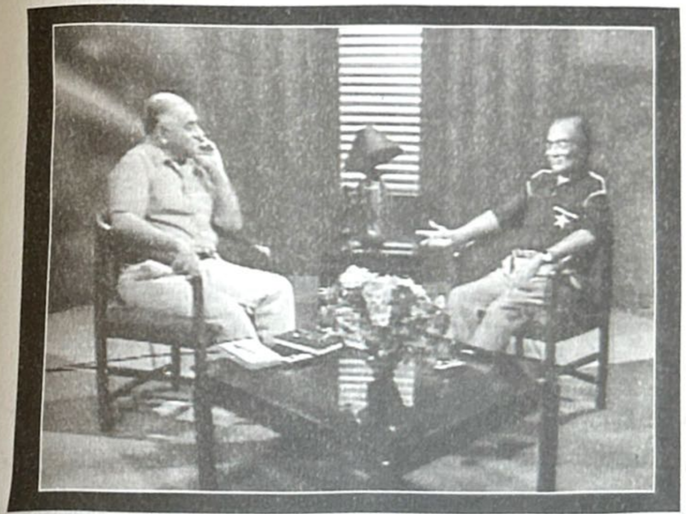

حنیف محمد: مشکور ہوں آپ کا۔

نعیم طاہر: حنیف صاحب گذشتہ دنوں آپ سے بات ہورہی تھی تو آپ نے کہا کہ آپ نے کہا بہت زیادہ تعریف نہ کریں (مزاحیہ انداز میں۔ ہاہاہا) لوگوں کو ریکارڈ تو معلوم ہے۔

حنیف محمد: جی۔

نعیم طاہر: اگر ڈکشنری میں حنیف محمد کا نام شامل ہوتا تو صرف تین الفاظ میں اس کا معانی لکھے ہوتے۔ انہماک، دلیری اور ثابت قدمی۔

اس طویل عرصے میں آپ نے اپنی کارکردگی سے قوم کے لیے کرکٹ کے کھیل سے وابستہ عظیم تاریخی لمحات کو یادگار بنا دیا۔ ان تمام لمحات پر روشنی ڈالنا اس لیے ممکن نہیں ہوگا کہ اس طویل داستان کو بیان کرنے کے لیے بھی بہت وقت درکار ہوگا۔ قوم کا ہر فرد آپ کی ان منفرد کامیابیوں اور کامرانیوں سے آشنا ہے لیکن میں یہاں چند ریکارڈ کا ذکر کرتا ہوں۔

1959ء میں حنیف محمد صاحب نے فرسٹ کلاس کرکٹ میں 499 رنز بنا Sir Donald n George Bradma کا سب سے زیادہ فرسٹ کلاس سکور کا ریکارڈ توڑا جب انہوں نے کراچی کی طرف سے بہاولپور کے خلاف یہ بڑا مجموعہ بنایا۔ اُن کے اس ریکارڈ کو 35 برس بعد ویسٹ انڈیز کے Brain Lara نے توڑا۔

آپ کی 337 رنز کی Bridge Town کے مقام پر اننگ کو کرکٹ کی تاریخ کی چوتھی بڑی اننگ کا درجہ حاصل ہے جس میں حنیف محمد صاحب نے 970 منٹ کریز (Crease) پر قیام کر کے خود کو ایک بڑا بلے باز ثابت کیا۔ آپ کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ آپ نے ٹیسٹ کی دونوں اننگز میں سنچریاں سکور کی تھیں۔ اس طرح سے اور بھی بہت سارے ریکارڈ ہیں۔ میں سب سے پہلے تو آپ کو ان کامیابیوں پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

حنیف محمد: بہت بہت شکریہ۔

نعیم طاہر: پوری قوم کو سب سے زیادہ فخر آپ کی شخصیت اور آپ کے کھیل پر اس لیے بھی ہے کہ آپ نے ہمیشہ پاکستان کے لیے کھیلا۔ آپ نے اپنے پیشہ وارانہ زندگی میں کوئی بھی اننگز اپنی ذات کے لیے نہیں کھیلی۔ آپ کے پاس ہر سٹروک موجود تھا اور آپ ہر طرح سے وار کر سکتے تھے۔ لیکن دفاعی انداز اس لیے اختیار کیا کہ پاکستان کو اس کی ضرورت تھی کہ بولرز (Bowlers) کے سامنے دیوار

بن کر کھڑے رہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ سترہ سالہ کیریئر میں پاکستانی بیٹنگ لائن اَپ میں ریڑھ کی ہڈی کی مانند رہے۔ تو چلیے گفتگو یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ آپ جوناگڑھ میں رہتے تھے۔

حنیف محمد: میں 21 دسمبر 1934ء کو جُوناگڑھ میں پیدا ہوا۔

نعیم طاہر: کیا آپ نے 1947ء میں ہجرت کی؟

حنیف محمد: ایک سال بعد 1948ء میں۔

نعیم طاہر: کیا وجوہات تھیں؟

حنیف محمد: تقسیم ہند کے وقت برصغیر میں ایسی سینکڑوں ، ریاستیں تھیں جہاں نوابوں کی حکومتیں تھیں۔ ایسی ہی ایک ریاست جوناگڑھ بھی تھی۔ اس بڑی اور خوشحال ریاست کی اکثریت مسلمانوں کی تھی اس ریاست کے نواب نے انڈیا کے برعکس پاکستان میں ضم ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے پاکستان جوناگڑھ سے بہت دُور تھا، آزادی کے چند مہینے بعد جوناگڑھ کو انڈیا میں فوجی عمل کے ساتھ باضابطہ طور پر ضم کرلیا گیا تھا۔ ہمارا گھر اسٹیشن روڈ پر واقع تھا۔

میں اُس وقت بہت کم عُمر تھا۔ میرے گھر کے سامنے سے فوجی ٹینک اور بندوقوں کے ساتھ گزرتے تو انہیں دیکھ کر خوف زدہ ہوجاتا تھا۔ میری امّی ، بھائی اور چاچا بچوں کو کھڑکی سے یہ مناظر دیکھنے سے منع کرتے تھے۔ کیونکہ بچوں کو ڈر اور خوف سے رات کو نیند نہیں آئے گی۔ مسلمانوں کے لیے اس ریاست میں رہنا بہت دُشوار تھا کیونکہ انہیں کافی مشکلات پیش آرہی تھیں۔ ان تمام حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے ہمارے بڑوں نے فیصلہ کیا کہ ہم پاکستان ہجرت کرلیں۔

نعیم طاہر: فسادات تو نہیں ہوئے۔

حنیف محمد: فسادات تو نہیں ہوئے لیکن خوف و ہراس کی فضا پھیلی ہوئی تھی۔ میں بہت کم عمر تھا اور بچوں کو اردگرد کے حالات و واقعات کی نہ تو زیادہ پرواہ ہوتی ہے اور نہ سمجھ۔

نعیم طاہر: آپ کی وہاں خاندانی جائیداد، کاروبار اور پیٹرول پمپ بھی تھا۔

حنیف محمد: میرے والد شیخ اسماعیل انڈین فوج میں کیپٹن تھے۔ فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ ایک سالٹ فیکٹری میں منیجر ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ذاتی موٹیل بھی تھا۔ جو " گرین ریسٹ ہاؤس" کے نام سے مشہور تھا، وہ ایک پیٹرول پمپ کے مالک بھی تھے۔ انہوں نے ہمیں پرآسائش زندگی

دی۔ ہمارا ایک گھر بھی مین روڈ پر تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: رات کے اندھیرے میں ہم اپنا سارا ساز و سامان وہیں چھوڑ کر سمندر کے راستے کراچی آن بسے۔

نعیم طاہر: کشتی کا سفر کیسا تھا؟

حنیف محمد: مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب 1954ء میں اپنی کرکٹ ٹیم کے ہمراہ انگلینڈ کے دورے پر بذریعہ بحری جہاز اکیس روز کا سفر طے کر کے پہنچے تھے تو اُس وقت جہاز میں بہت طبیعت خراب ہوتی تھی۔ لیکن ہجرت کے وقت جب کراچی آرہے تھے تو خوف و ہراس کے باعث کشتی میں طبیعت خراب نہیں ہوئی۔ اس لمحے فطری طور پر ایک خاص جذبہ ہمارے اندر پیدا ہوگیا تھا۔

نعیم طاہر: آپ نے کراچی کا سفر جُوناگڑھ کے کس ساحل سے شروع کیا تھا؟

حنیف محمد: ویراول (Veraval) ساحل سے۔

نعیم طاہر: کیا کبھی اپنے آبائی گھر اور شہر دوبارہ بھی گئے؟

حنیف محمد: چند برس پہلے میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کے ساتھ میچ کھیلنے بھارت کے دورے پر گیا۔ میری بیگم بھی ہمراہ تھیں۔ میں نے راولپنڈی سے جوناگڑھ کا بھی ویزا لیا۔ لیکن میں وہاں جانہ سکا۔

نعیم طاہر: کیا ابھی بھی آپ کے عزیز و اقارب جوناگڑھ میں رہائش پذیر ہیں؟

حنیف محمد: کچھ عرصہ پہلے تک تو تھے لیکن اب نہیں ہیں۔

نعیم طاہر: کیا نئے ملک میں معاشی دشواریاں اور مشکلات پیش آئیں۔

حنیف محمد: بہت ہی زیادہ۔ میں آج بھی آنکھ بند کروں تو سب مصائب و تکالیف نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔

نعیم طاہر: کچھ بتایئے۔

حنیف محمد: میرے بھائی وزیر محمد اور رئیس محمد جوناگڑھ کالج میں پڑھتے تھے اور کالج کی کرکٹ ٹیم کا بھی حصہ تھے۔ میں اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ کراچی آنے کے بعد میرے بھائی وزیر اور رئیس کو حبیب بینک میں کرکٹ کی بنیاد پر نوکری مل گئی۔ ان کی ملازمت سے گھر کا خرچہ چلنے لگا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: میرے والد سالٹ فیکٹری میں منیجر تھے۔ وہ گلے کے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ سعید منزل پر ایک ہسپتال واقع تھا جہاں کینسر کے ابتدائی مراحل میں مبتلا مریضوں کا

Scanned with CamScanner

ایسے لڑاتے جیسے شطرنج کے کھیل میں مُہرے لڑاتے ہیں۔ میچ سے پہلے ہر کھلاڑی کی کارکردگی کے بارے میں ان کی رائے ہمیشہ درست ثابت ہوتی تھی۔ یہ خوبی بہت کم کپتانوں میں ہوتی ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: گرمی بھی شدید تھی کیونکہ اخباروں میں بھی یہ خبر پڑھتے تھے کہ انگلینڈ میں بہت سالوں بعد شدید گرمی کی لہر آئی ہے۔ لارڈز (Lords) میں تیسرے روز ہمارا میچ شروع ہوا تھا جو برابر (Draw) ہوگیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب ہماری پہلی باری آئی تو میں نے اور علیم الدین نے میچ کا آغاز کیا۔ میں نے دو اوور میں 19 رنز بنائے۔ کیونکہ پچ گیلی تھی اور اُس زمانے میں پچ کو ڈھانپتے نہیں تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: صرف باؤلنگ والے حصے کو ڈھانپ دیتے تھے تاکہ باؤلرز پھسل نہ جائیں۔ باقی پچ پہ پانی گرتا تھا۔

نعیم طاہر: اس سے تو باؤلر کو فائدہ ہوا ہوگا۔

حنیف محمد: بہت زیادہ۔

نعیم طاہر: باؤلر کو خشک حصہ مل گیا اور آپ کو گیلی پچ ملی۔

حنیف محمد: مجھے معلوم تھا کہ پچ گیلی ہے اور کچھ دیر میں گڑھے پڑ جائیں گے۔ میں نے ہر ممکن کوشش سے دو اورز میں 19 رنز بنا لیے۔ تیسرے اوور میں سپن (Spin) باؤلر David Sheppard آگئے اور اسی اوور میں گیند میرے دستانے سے ٹکرائی اور میں کیچ آؤٹ ہوگیا۔ خالد وزیر اور ذوالفقار احمد نے اچھے رنز بنا لیے تھے۔ اب چوتھے روز کا کھیل باقی رہ گیا تھا اور محکمہ موسمیات کے مطابق اُس دن بارش کے بہت زیادہ امکانات تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: انگلینڈ کی ٹیم کی بہت مضبوط پوزیشن تھی۔ اُن کی ٹیم میں Denis Compton ، Leonard Hutton جیسے بڑے کھلاڑی شامل تھے۔

نعیم طاہر: آٹھ وکٹیں باقی تھیں۔

حنیف محمد: اُن کی خواہش تھی کہ ہم چوتھے دن ہی میچ ختم کر دیں۔ ہمارے پاس فضل محمود جیسے بڑے باؤلر

تھے۔ گیلی پچ پر ان کے اوور میں اسکور بنانا بہت مشکل تھا۔ ہمارا کپتان بھی بہت اچھی حکمت عملی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ہم نے انگلینڈ کی ٹیم پر بہت دباؤ ڈالنے کے بعد آٹھ کھلاڑی آؤٹ کر دیے۔ اب آخری دن کے کھیل میں دونوں ٹیموں کے درمیان جیت کا فیصلہ ہونا تھا۔

نعیم طاہر: مجھے یاد ہے کہ بہت اضطراب اور ذہنی دباؤ تھا۔ پوری قوم نتیجے کے انتظار میں ریڈیو پر تبصرہ سُن رہی تھی۔

حنیف محمد: کسی باؤلر نے چوکا بھی دے دیا، کسی نے کیچ بھی نہ کیا۔ چوبیس رنز رہ گئے اور آخری وکٹ آ گئی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: آخری بلے باز Johnny Wardle اور Jim Mcconon تھے۔ ہم انتظار میں تھے کہ وہ آخری یا پانچویں گیند پر رنز لینے کی کوشش کریں گے۔ یوں ہوا کہ آخری گیند تھی۔ کور (Cover) میں میری فیلڈنگ تھی۔ اس نے ایکسٹرا کور پر کھیلا اور رن کے لیے بھاگا۔ میں نے گیند پکڑا اور جیسے ہی میں گیند وکٹ کی جانب پھینکنے لگا تو مجھے ایک ہی وکٹ نظر آ رہی تھی۔ میں نے گیند کو اچھال کر وکٹ کی طرف پھینکا تاکہ اُوپر سے نہ گزر جائے۔ اور گیند وکٹ سے ٹکرا گئی اور انگلینڈ کے امپائر Frank Chester جن کا ایک ہاتھ نقلی تھا، نے آؤٹ دیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: ہماری قوم ٹیم کی کارکردگی سے بہت خوش تھی۔ جب ہم اندر گئے لوگوں نے ہماری بہت تعریف کی۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کہاں ہے۔ وہ پاکستان کو بھارت کا ہی حصہ سمجھتے تھے۔ میرے خیال میں اُس روز پوری دنیا کو معلوم ہوا کہ پاکستان ایک علیحدہ مملکت ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: یہ بہت بڑی بات تھی۔

نعیم طاہر: پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سَر اس کامیابی کا سہرا ہے کہ انہوں نے انگلینڈ جیسی مضبوط ٹیم کو شکست دے کر پوری دنیا میں پاکستان کا نام روشن کیا۔

حنیف محمد: کرکٹ کے کھیل میں پاکستانی ٹیم کا ریکارڈ ہمیشہ اچھا رہا ہے۔ شروع میں ہمارے پاس سولہ یا سترہ کھلاڑی ہی ٹیم کا حصہ تھے۔ اور اس میں سے گیارہ کھلاڑی لازمی منتخب کرنے ہوتے تھے۔ ان میں سے بھی چند کھلاڑی اچھا نہیں کھیلتے تھے۔ ٹیم کی اچھی کارکردگی کا انحصار کچھ کھلاڑیوں پر ہی ہوتا تھا۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: اب میں ٹیسٹ کرکٹ کی جانب ایک بار دوبارہ بڑھتا ہوں۔

حنیف محمد: 1955ء میں ڈرنگ(DRING) اسٹیڈیم بہاولپور میں ہم نے ٹیسٹ میچ کی سیریز کھیلی۔ میں نے دن کے اختتام سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ قبل اپنی اولین بین الاقوامی سنچری مکمل کی۔ اور یہ کسی پاکستانی بلے باز کی ہوم گراؤنڈ میں پہلی ملکی سنچری تھی۔ میں نے تقریباً 510 منٹ کریز پر گزارے اور 142 رنز بنا کر POLLY UMRIGAR کی گیند پر کیچ آؤٹ ہوا۔ اس اننگز میں 17 چوکے اور ایک چھکا شامل تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ہمارا بہاولپور میں ڈیڑھ ماہ کے لیے تربیتی کیمپ بھی لگا تھا۔ وہاں رہائش کی جگہ نہ تھی تو ہم نے تالاب کے کنارے خیموں میں قیام کیا۔ کیمپ میں ہر بات سکھائی جاتی تھی۔ کھانا کھاتے وقت کانٹا چھری کا استعمال، گفتگو کے ادب وآداب وغیرہ۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: ہم صُبح سویرے اُٹھ جاتے تھے اور دوڑ لگاتے تھے۔ ہمارے کچھ کھلاڑی محنت اور کوشش کے باوجود دوڑ میں پیچھے رہ جاتے تھے۔ اس وقت برآمدے میں صرف ایک ہی بلب جلتا تھا۔ اب جب کوئی کھلاڑی دوڑ لگانے کے لیے بھاگ کر جاتا تو اندھیرے میں صرف یہ نظر آتا تھا کہ کوئی جارہا ہے، لیکن یہ نظر نہیں تھا کہ اس نے میدان کا پورا چکر لگایا ہے یا آدھا چکر لگایا ہے۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔۔۔

حنیف محمد: ہم میں جو نوجوان لڑکے تھے جیسے وقار، حسیب اور نسیم الغنی وغیرہ بہت محنت کرتے تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ یہ بتائیں کی 1958ء میں پاکستان کے دورہ ویسٹ انڈیز میں یادگار سیریز کھیلی گئی جس میں ویسٹ انڈیز نے پہلے کھیلتے ہوئے بہت بڑا اسکور کرلیا اور پاکستان کو جیتنے کے لیے ایک بہت بڑا ہدف دے دیا اور پاکستان کے لیے یہ ٹیسٹ بچانا بہت مشکل ہوگیا تھا۔

حنیف محمد: برج ٹاؤن(Bridge Town) کے پہلے ٹیسٹ میں ویسٹ انڈیز نے پہلے کھیلتے ہوئے 9 وکٹوں کے نقصان پر 576 رنز بنائے جس میں Everton Weekes 197 اور Corade Hunte 142 رنز کے ساتھ نمایاں رہے۔ پاکستان کی طرف سے فضل محمود نے تین اور محمود حسین نے چار کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا۔ اس بڑے سکور کے جواب میں پاکستان کی ٹیم 106 رنز پر ڈھیر ہوگئی۔ Roy Gilchrist دُنیا کے تیز رفتار باؤلر تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس

پچ پر اتنی تیز گیند میں نے نہ کبھی دیکھی اور نہ ہی کبھی کھیلی ہوگی۔ اس سے قبل انگلینڈ میں مجھے تیز رفتار باؤلر Frank tyson کے ساتھ کھیلنے کا تجربہ تھا۔ لیکن Gilchrist بہت ہی تیز رفتار گیند پھینکتا تھا۔ ہم نے حفاظتی سامان بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ نہ ہیلمٹ، نہ تھائی گارڈ، نہ بیٹنگ پیڈز اور ہاتھوں کے دستانے بھی مضبوط نہیں تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ اوہو۔۔۔

حنیف محمد: پہلی اننگز میں امتیاز احمد نے 20 اور میں نے 17 رنز بنائے۔ چند گھنٹوں بعد دوبارہ باری آگئی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: دوسری اننگ میں ہم نے اپنا ڈر اور خوف سب ختم کردیا۔ ہیلمٹ اور دستانوں کی بالکل پرواہ نہ کی۔ صرف ایک بات پر توجہ مرکوز رکھی کہ بلے سے ہم نے اپنا دفاع کرنا ہے، اور گیند سے خود کو بچانا ہے اور بلے سے کھیلنا ہے

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: میں نے اور امتیاز نے میچ کا بہت اچھا آغاز کیا، ہم نے بہت دیر کریز پر ڈیرے ڈالے رکھے۔ امتیاز LBW آؤٹ ہوگیا لیکن یہ امپائر کا غلط فیصلہ تھا کیونکہ اس زمانے میں ایمپائر بھی اپنے اپنے ہوتے تھے، میں نے ہر گیند پر کھیلا۔ شام ہوگئی اور اس روز کی اننگ مکمل ہوگئی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: وہاں مجھے پاکستانی دوست مل گئے۔ شام کو ان کے گھر جاتا۔ پاکستانی کھانا کھاتا، موسیقی سُنتا اور دس بجے ہوٹل آجاتا کیونکہ دس بجے ہوٹل میں آنا لازمی ہوتا تھا۔ میں اور میرے بڑے بھائی وزیر محمد ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: جب میں کمرے میں آتا تو کاردار صاحب اور وزیر محمد صاحب باتیں کررہے ہوتے تھے اور کراچی کی صبح دس بجے والی خبریں بھی سن رہے ہوتے تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ اچھا۔

حنیف محمد: ایک روز میں کمرے میں آیا تو کاردار صاحب نے کاغذ کی چٹ پر ایک عبارت لکھ کر میرے کمرے میں رکھ دی۔ اور اس پر یہ تحریر تھا کہ: تم ہماری آخری امید ہو اور تم پاکستان کو فتح دلوا سکتے ہیں۔

دوسرے دن ایک اور عبارت تیسرے دن مختلف عبارت لکھ گئے۔

نعیم طاہر: آپ تین دن سے بیٹنگ کر رہے تھے۔

حنیف: جی کرتے چلے جا رہا تھا۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔ جو کپتان کہتا وہ کرتے رہے۔

حنیف محمد: یہ میرے اللہ کا کرم تھا۔ میں کوئی بہت بڑا بلے باز نہیں تھا، میں اوسط درجے کی بیٹنگ کرتا تھا۔ شاید میری کامیابی کی وجہ میری توجہ، انہماک اور استقامت ہے۔ اپنے ملک اور ٹیم کی عزت بچانے کے لیے کوئی غلط گیند نہیں کھیلی۔ جیسی گیند ہوتی ویسی کھیلتا گیا۔

آخری پرچی میں کاردار صاحب نے لکھا: ''اگر آخری روز کے کھیل میں چائے کے وقفے تک کھیل جاؤ تو پاکستان یقینی شکست سے بچ جائے گا'' اور ایسا ہی ہوا کہ میں چائے کے وقفے تک کھیلا۔

لیکن مجھے کاردار صاحب کی عبارت پڑھ کر افسوس بھی ہوا اور بعد میں، میں نے ان سے شکوہ بھی کیا۔ جب میں نے 334 رنز بنائے تو اعلان ہوا کہ میں نے Donald Bradman کا ریکارڈ توڑ دیا اور جب 337 رنز بنا لیے تو اعلان ہوا کہ WR HAMMOND کا 336 کا عالمی ریکارڈ ٹوٹ گیا۔

نعیم طاہر: آپ کی Barbados کی تیز وکٹ پر بیٹنگ نے ویسٹ انڈیز کے جزیروں سے لے کر پاکستان کے گلی کوچوں تک سب کو حیران کر دیا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو کمنٹری میچ سے جڑے رہنے کا واحد ذریعہ تھی اور سائے ڈھلنے لگتے تھے۔ لوگ گلیوں میں شام ہوتے ہی ریڈیو بلند آواز میں لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان تین راتوں میں اگر BARBADOS میں شکست سے لڑ رہے تھے تو پاکستان میں کرکٹ کے متوالے بھی سو نہ سکے۔ رات بھر ریڈیو سے جڑی ہوئی سماعتیں ہر ساعت میں دعا کرتی تھیں کہ حنیف آؤٹ نہ ہو۔

حنیف محمد: ویسٹ انڈیز میں چھ دن کا کھیل ہوتا ہے۔ درمیان میں ایک دن آرام کرنے کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔ وہاں گرمی بہت زیادہ ہے تو پانچ گھنٹے روز کھیلتے اور یوں چھ دن تیس گھنٹے کا ٹیسٹ میچ ہوتا ہے۔ ساتویں روز جب DS ATKINSON نے گیند میری جانب پھینکا تو گیند میرے بلے کے ہینڈل (Handle) سے ٹکرا کر OFF-SIDE کی جانب ہوا میں لہرائی اور ALEXANDAR نے کیچ کر لیا۔ اُس لمحے مجھے افسوس نہ ہوا کیونکہ میرا پاؤں بھی زخمی تھا اور

ناک سے بھی خون بہہ رہا تھا۔

مجھے افسوس بہت دنوں بعد ہوا جب مجھے پتہ چلا کہ میں عالمی ریکارڈ سے 29 رنز کی دوری پر تھا۔

نعیم طاہر: لیکن آپ نے پاکستان کو یقینی شکست سے بچا لیا۔

حنیف محمد: یہ اللہ پاک کا کرم ہے۔ اس اننگ میں چار بلے بازوں کے ساتھ میری 100 رنز کی شراکت داری ہوئی۔ یعنی ایک رن تو ہم لازمی لیتے تھے۔

نعیم طاہر: یہ سب اللہ کی کرم نوازی ہے کہ آپ اپنی توجہ اور استقامت کو برقرار رکھتے ہوئے میچ کے دوران بلے کا درست انداز میں استعمال کرتے ہے۔

حنیف محمد: ہمارے ملک میں فطری استعداد اور باصلاحیت کھلاڑیوں کی کمی نہیں ہے۔ ہم نے عالمی سطح پر نامور کھلاڑی پیدا کیے جن کی ایک طویل فہرست ہے۔

نعیم طاہر: آپ کے خیال میں کھلاڑی کے لیے موقع کی مناسبت سے اچھی حکمت عملی سے کام لینا زیادہ ضروری ہے؟

حنیف محمد: بلے باز ٹیم کی حکمت عملی کے مطابق جارحانہ یا دفاعی بلے بازی کرتا ہے۔ میچ کی صورت حال کے مطابق کپتان بلے باز اور گیند کی ترتیب بدل بھی سکتا ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف محمد: ٹیسٹ میچ کھیلنے سے پہلے اپنے اندر سکت اور قوت برداشت بڑھائیں اور خود کو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے اتنا مضبوط بنائیں کہ پانچ دن کھیلنا ہے۔ ایک روزہ کرکٹ میچ نے دنیا بھر میں اس کھیل کو فروغ دیا ہے کیونکہ ٹیسٹ میچ میں لوگوں کی دلچسپی بہت کم ہوگئی ہے۔

ہمارے پاکستان و بھارت میں ایک روزہ میچ دیکھنے کا رجحان تیزی سے بڑھا ہے اور کرکٹ کو توسیع ملی ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: یہ اچھا اقدام تھا لیکن اس رجحان نے بلے بازوں کی کارکردگی کو بھی متاثر کیا ہے۔ اور وہ ٹیسٹ میچ اور ایک روزہ میچ میں فرق بھول گئے ہیں۔ یہاں انہیں ٹیسٹ میچ اور ایک روزہ کھیل کے داؤ پیچ میں فرق کرنا ہوگا۔

نعیم طاہر: ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ کھیلنے والے بہترین کھلاڑی کون سے ہیں؟

Scanned with CamScanner

حنیف محمد: ہمارے دور میں تو یہ تھی ہی نہیں۔ پاکستان نے اپنا پہلا ایک روزہ میچ نیوزی لینڈ کے خلاف کھیلا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: بہترین کھلاڑیوں میں ماجد خان، ظہیر عباس، صادق محمد، جاوید میانداد اور اعجاز احمد۔ موجودہ دور میں انضمام الحق بھی ہیں۔ 1992ء ورلڈ کپ کا سہرا تین یا چار لوگوں کے سر ہے جن میں انضمام الحق کا بھی نام شامل ہے کہ انہوں نے 37 گیندوں پر 60 رنز کی اننگز کھیلی۔

نعیم: درست۔

حنیف محمد: وسیم اکرم نے ایک ہی اوور میں مسلسل دو وکٹیں لے کر میچ کا نقشہ ہی بدل دیا۔ جاوید میانداد بیمار تھے لیکن پھر بھی بہت اچھا کھیلے۔

نعیم طاہر: جی بہت اچھا کھیلے۔

حنیف محمد: عمران خان کی قیادت میں ٹیم کے اندر مقابلہ کرنے کی صلاحیت اس قدر زیادہ ہوئی کہ ٹیم نے اس مقام سے جیت کا سفر شروع کیا جہاں عام طور پر ٹیمیں ہمت چھوڑ دیتی ہیں۔ عمران خان کی اچھی حکمت عملی نے ناممکن کو ممکن کر دیا۔ اللہ پاک نے اُن کی مدد کی اور ہم نے 1992ء کا ورلڈ کپ جیتا اور پاکستان ایک روزہ کرکٹ کا فاتح عالم بن گیا۔

نعیم طاہر: وہ بہت اچھے کپتان تھے۔

حنیف محمد: جی بہت شاندار۔

نعیم طاہر: اچھا تو اب ذرا یہ بتائیں کہ آپ کھانا بھی پکاتے ہیں؟

حنیف محمد: جی میں بہت شوق سے کھانا پکاتا ہوں۔

نعیم طاہر: آپ شوق سے پراٹھا بناتے ہیں۔

حنیف محمد: میچ کے دوران بطور ماہر تبصرہ نگار جب تبصرے (Commentary) کے لیے جاتے تھے تو صبح صبح پہنچنا ہوتا تھا جبکہ مجھے دیر سے اٹھنے کی عادت تھی۔ تو میں پراٹھے کا رول بنا کر ساتھ لے جاتا تھا اور بعد میں جُوس اور چائے وغیرہ پی لیتے تھے۔ میں پاکستان کے سبھی کھلاڑیوں کو نصیحت کرتا تھا کہ اپنی آٹھ یا نو گھنٹے کی نیند ضرور پوری کریں تا کہ آپ صبح کے وقت تروتازہ ہوں۔ بالخصوص اوپنر بلے باز۔ آپ کو گیند سو فیصد دکھائی نہیں دے سکتی جب تک آپ کی آنکھیں تروتازہ نہ ہوں گی۔

نعیم طاہر: درست۔

حنیف محمد: آپ اپنے ملک کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ نظم وضبط کی پابندی کریں۔ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لیں تا کہ ذہن ہر وقت ذہنی دباؤ کا شکار نہ رہے۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

حنیف محمد: آپ اپنے ملک کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ نظم وضبط کی پابندی کریں۔ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لیں۔ تا کہ ذہن ہر وقت ذہنی دباؤ کا شکار نہ رہے۔ آپ اپنے ملک کے لیے ہر لمحہ فرض کی ادائیگی پر معمور ہیں۔

نعیم طاہر: ایک بار کمنٹری کرتے ہوئے آپ پراٹھا بھی ساتھ کھا رہے تھے۔ کہ اسی دوران ایک بلے باز آؤٹ ہو گیا۔ ایک صاحب نے آپ کو پراٹھا کھاتے دیکھ لیا لیکن اس کے باوجود آپ نے آؤٹ ہونے کا بالکل صحیح احوال بیان کیا۔ معلوم نہیں آپ نے وہ منظر دیکھا بھی تھا یا نہیں۔

حنیف محمد: میں نے قدرتی طور پر وہ منظر دیکھ لیا تھا۔ ماجد خان کے جوتے پر گیند لگی اور ایمپائر نے کیچ آؤٹ دے دیا۔۔ مجھے جہاں تک یاد ہے کہ منیر صاحب میچ کی کمنٹری کر رہے تھے۔ اور میں بطور ماہر کرکٹ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بہت اچھی کمنٹری کرتے تھے۔ میری ان سے دوستی بھی ہے کبھی کبھی پراٹھا بھی کھا لیتے ہیں۔۔ میں نے سوچا کہ منیر صاحب دیکھ رہے ہیں تو میں زیادہ توجہ نہیں دے رہا تھا اور پراٹھا کھا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے میں نے ماجد خان کے آؤٹ ہونے کا منظر دیکھ لیا تھا ورنہ میں پھنس جاتا۔

نعیم طاہر: اور کھانے میں کیا پکا لیتے ہیں؟

حنیف محمد: قیمہ اور کڑاہی گوشت بنا لیتا ہوں اور مجھے پسند بھی ہے۔ جب میں انگلینڈ جاتا ہوں تو میرے بھائی کے بیٹے مجھ سے خاص فرمائش کرتے ہیں۔

نعیم طاہر: کہ کڑاہی بنائیں۔

حنیف محمد: وہ ایک مخصوص جگہ سے گوشت خرید کر اُس کا قیمہ بنواتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ بہت دنوں سے آپ کے ہاتھ کا قیمہ نہیں کھایا۔

نعیم طاہر: اچھا یہ بتائیے کہ آپ کی کرکٹ سے ایک طویل عرصہ وابستگی رہی۔ آپ نے کرکٹ کے رسالہ کا

اجراء کیا۔ لاتعداد کامیابیاں حاصل کیں۔ بہت شہرت بھی حاصل کی۔ "Playing For Pakistan" کے نام سے آپ بیتی بھی چھپ گئی۔ زندگی کی اس اننگ میں کوئی ایسا واقعہ بھی پیش آیا جس سے آپ کو دلی صدمہ پہنچا ہو۔

حنیف محمد: زندگی بیک وقت دکھ اور سکھ کی دھوپ چھاؤں ہے۔ انسان ہونے کے ناطے میرے ساتھ بھی خوشی اور غم لازم وملزوم رہے۔ لیکن اللہ پاک کا مجھ پر خاص کرم رہا اور میں اس حوالے سے بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے اللہ پاک نے زیادہ غم نہیں دیے۔ والدین کی وفات کے صدمے سے تو دوچار ہوا لیکن آج ہم جس مقام پر ہیں یہ سب ان کی محنت کا ثمر ہے۔ ان کامیابیوں پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور پھر سوچتا ہوں کہ یہ دنیا فانی ہے اور سب نے ایک دن چلے جانا ہے۔

نعیم طاہر: جی یہ فطری عمل ہے۔ اللہ پاک ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین)۔

حنیف محمد: جی آمین۔

نعیم طاہر: آپ کرکٹ سے ریٹائر ہوئے یا آپ کو جبری ریٹائر کیا گیا؟

حنیف محمد: میں ریٹائر نہیں ہوا تھا۔ مجھے کاردار صاحب نے ریٹائر کیا۔ میں کاردار صاحب کی بہت عزت کرتا ہوں، اُنہوں نے ہی مجھے کرکٹ میں متعارف بھی کروایا۔ اُنہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن پھر اچانک مجھے ریٹائر کر دیا گیا۔ کوئی اور مجھے ریٹائر کرتا تو شاید مجھے برا نہ لگتا۔ باغ جناح میں امتیاز اور کاردار صاحب بچوں کے لیے ایک فلم بنا رہے تھے۔ جس میں ان کو کرکٹ کے داؤ پیچ سکھا رہے تھے۔ کاردار صاحب ٹیلی وژن کے لیے بننے والی اس فلم کے ہدایت کار اور کیمرا مین کو ہدایات دے رہے تھے۔ دو گھنٹے کی ریکارڈنگ کے بعد چائے اور سینڈوچ کا وقفہ ہوتا تھا۔ وقفے کے دوران میں نے کاردار صاحب سے کہا کہ میں نے زندگی بھر کرکٹ کھیلی ہے، کرکٹ میرا سرمایہ حیات ہے۔ مجھے کپتانی کا شوق نہیں ہے۔

نعیم طاہر: آپ کی کپتانی کا ریکارڈ بہت اچھا رہا ہے۔

حنیف محمد: اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کپتان بن کر کھیلنا چاہتا ہوں تو یہ بات درست نہیں۔ میری صرف ایک خواہش ہے کہ آپ مجھے ریٹائرمنٹ سے پہلے آگاہ کریں گے کہ یہ تمہارا آخری ملکی یا بین الاقوامی ٹیسٹ میچ ہے یا آخری دورہ ہے تاکہ میں خود کو اس حقیقت کے لیے تیار رکھوں اور خود اپنی ریٹائرمنٹ کا اعلان کروں۔

نعیم طاہر: ذہنی طور پر بھی تیار ہو جائیں۔

حنیف محمد: ہم اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں اور ملک کے لیے کھیلتے ہیں۔ ہم عوام کے کھلاڑی ہیں۔ اگر ایک بھی آدمی اسٹیڈیم میں نہ ہوں تو کھلاڑی کو کھیلنے کا لطف نہیں آتا۔ وہ عوام جو مجھے بیس برس سے کھیلتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور جب ان کے سامنے آخری اننگ کھیلنے جاؤں تو وہ میرا پرتپاک استقبال کریں اور بہت باعزت طریقے سے مجھے کرکٹ کے میدان سے رخصت کریں۔ یہی دُنیا کا دستور ہے۔ میں بھی اپنے ان لمحات کو یادگار بنانا چاہتا تھا لیکن پاکستان میں کبھی ایسا نہ ہوا، ہر کھلاڑی کسی نہ کسی سازش کا شکار ہوا۔

نعیم طاہر: یہ بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے۔

حنیف: میں نے ٹیلی وژن اور اخبارات میں بھی اس المیے کا اظہار کیا۔ اس سب کے باوجود کاردار صاحب کی ابھی بھی دل میں بہت عزت ہے۔ اللہ پاک ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے (آمین)

نعیم طاہر: پاکستانی کرکٹ میں مختلف موقعوں پر سیاست اور کھلاڑیوں کا باغیانہ رویہ اختیار کرنے کا سلسلہ برسوں سے چلا آ رہا ہے، اس کی کیا وجوہات ہیں؟ اس کی ایک مثال تو کاردار صاحب کے زمانے میں جاوید میانداد کے خلاف ہونے والی کی ہے؟

حنیف محمد: میں ایک بات کی وضاحت کر دوں میں اس طرح کی سیاست پر بالکل یقین نہیں کرتا۔ کاردار صاحب کے زمانے میں بھی تین لڑکوں کو ٹیم سے نکال دیا۔ اس کی بہت ساری وجوہات تھیں کہ پہلے کرکٹ میں زیادہ پیسے نہیں تھے۔ اب روز کے پندرہ روپے ملتے تھے۔

نعیم طاہر: اس دور میں پندرہ روپے، بہت زیادہ رقم تھی۔

حنیف محمد: ہمیں کِٹ، جوتے اور بلاّ بھی اپنا لانا ہوتا تھا۔ آمدورفت کے لیے بھی پیسے نہیں ملتے تھے۔ کُچھ عرصے بعد سو روپے ملنے لگے۔ کرکٹ کے کھیل کو فروغ ملتا گیا اور پیشہ ورحسد بھی بڑھنے لگا۔ ابھی آپ نے ذکر کیا کاردار صاحب کے زمانے میں جاوید میانداد کی مخالفت کی۔ اصل واقعہ کچھ یوں ہے کہ انگلینڈ کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی ہوئی تھی۔ دونوں ٹیموں کے درمیان حیدر آباد شہر میں میچ ہونا تھا۔ پاکستان کی جانب سے میچ کی کمنٹری کرنے کے لیے میں وہیں پر موجود تھا۔ پاکستان کرکٹ بورڈ کی طرف سے تشکیل کردہ ٹیم میں سے چھ کھلاڑیوں نے کچھ مطالبات کر دیے۔ اسی

وقت رات آٹھ بجے سے بارہ بجے تک کاردار صاحب نے ٹیلی فون پر ہی گفت وشنید کر کے ایک اور ٹیم تشکیل کر کے حیدر آباد منگوا لی۔ اور ٹیم ایک رات میں حیدر آباد پہنچ گئی۔ یوں ایک ٹیم کے خلاف کھیلنے کے لیے پاکستان کی جانب سے دو ٹیمیں وہاں پہنچ گئیں۔ جب وسیم اکرم خلاف ہوا۔

نعیم طاہر: جاوید میانداد کے۔

حنیف محمد: جاوید میانداد سے مخالفت پیشہ ورحسد کی بنا پر تھی۔ دوسری وجہ گروپ بندی ہے۔ تیسری وجہ جس کا مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔ وہ ہے Match Fixing۔

نعیم طاہر: جی۔

حنیف محمد: اگر کسی ایک کھلاڑی پر Match Fixing کا الزام لگا دیا جاتا ہے تو باقی کھلاڑی بھی اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہوتی ہے اس کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ جنوبی افریقہ کے کپتان Hansie Cronje پر بھی یہی الزام عائد کیا گیا تھا۔ انہوں نے قبول بھی کیا کہ میں نے اپنی ٹیم کی حکمت عملی کے حوالے سے کچھ معلومات مخالف ٹیم کو دی تھیں۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم سے بھی لوگوں کو سیاست اور گروپ بندی کی بہت سی شکایات ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ Dennis Lillee، Jeff Thomson اور Steven Finn کے مقابلے پر وسیم اکرم، عمران خان، وقار یونس اور عبدالقادر ہیں۔

نعیم طاہر: آپ کو پاکستان کرکٹ ٹیم کی صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد ہے؟

حنیف محمد: جی بالکل۔ ہمارے دورے میں تو باقاعدہ تربیت کی بھی سہولت موجود نہ تھی۔ ہمیں تو عملی تربیت کے لیے کھیل کے میدان بھی میسر نہ تھے۔ آج کل تو پاکستان کرکٹ بورڈ (PCB) باقاعدہ پندرہ، سترہ اور انیس برس کے کھلاڑی منتخب کرتی ہے۔ دو ماہ کے تربیتی کیمپ لگائے جاتے ہیں اور باقاعدہ طور پر کرکٹ کے داؤ پیچ بھی سکھائے جاتے ہیں۔ یہ سب سہولیات ہمارے زمانے میں نہیں تھی۔

نعیم طاہر: کرکٹ میں بیٹنگ، بولنگ اور فیلڈنگ سکھانے کے علاوہ اخلاقی اقدار بھی سکھانے چاہیے۔ متفقہ اور اجتماعی کوشش سے اپنے مُلک کا نام روشن کریں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

حنیف محمد: میں ایک بار کینٹری کلب مرید کے کے تربیتی کیمپ میں گیا اور اسی تربیتی کیمپ میں ایک ہفتہ قیام بھی کیا۔ اس تربیتی کیمپ میں باقاعدہ کھلاڑیوں کو ویڈیوز دکھائی جاتی ہیں۔ پروفیسرز لیکچر دیتے

ہیں اور انگریزی بھی سکھائی جاتی ہے۔

نعیم طاہر: فرض کیجئے کہ اگر ہمارا جنوبی افریقہ کے ساتھ میچ ہے تو کیا میچ سے پہلے بلے باز کو اس ٹیم کے باؤلرز کے داؤ پیچ دکھائے جاتے ہیں یا دکھائے جانے چاہئیں؟

حنیف محمد: جی بالکل دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے کھلاڑیوں کو ابھی اس سے کھیلنے کی عادت نہیں ہوئی۔ لیکن ہمارے کھلاڑیوں کو ابھی اس سے سیکھنے کی عادت نہیں ہوئی۔ جبکہ باؤلرز کے داؤ پیچ دیکھنا اور پھر اس سے سیکھنا لازم وملزوم فعل ہے۔ اس کھیل کو گہرائی میں سمجھنے کے لیے طویل عرصہ درکار ہے۔

نعیم طاہر: کیا آپ اب بھی کھلاڑیوں کو تربیت دیتے ہیں۔ آپ پاکستان کرکٹ بورڈ کے ساتھ رابطے میں ہیں؟

حنیف محمد: پہلے میں ڈیفنس میں تربیت دیتا تھا۔ پھر مجھ سے گراؤنڈ لے لی۔ میں نے پاکستان کرکٹ بورڈ سے درخواست کی تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ سے 500 روپے مہینہ لیں گے۔ لیکن پھر انہوں نے زیادہ پیسوں پر کسی اور کو دے دی اور مجھے کہا کہ PCB کے پاس نہیں ہے۔ مستقبل میں اس کا فیصلہ کریں گے۔

نعیم اچھا۔ تب سے سوچ رہے ہیں۔

حنیف محمد: میں اب بھی کبھی کبھی کسٹم میں چلا جاتا ہوں۔ وہاں بچے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ یا شعیب کا بیٹا کراچی میں تھا اس کی ٹیم بنا دی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

حنیف محمد: اپنے محلے کے لڑکوں کا آپس میں میچ کروا دیا۔ ان کو دوپہر کا کھانا کھلاتا ہوں۔ ان کے لیے سینڈوچ لے جاتا ہوں۔ ان کے میچ سے محظوظ ہوتا ہوں۔ ہم ان تمام مراحل سے گزر چکے ہوتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ نوجوان کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کیا اقدام کرنے چاہیے۔

نعیم طاہر: کرکٹ کے کھیل میں عالمی کپ کی بہت اہمیت ہے۔ پچھلے عالمی کپ میں ہماری کارکردگی بالکل بھی اچھی نہ تھی۔ آنے والے وقت کے لیے جو ہماری ٹیم کی تربیت کے لیے حکمت عملی اپنائی جارہی ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

حنیف محمد: سابقہ ورلڈ کپ میں تو میں نہیں گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہونے والے عالمی کپ کے مقابلوں میں گیا تھا۔ ہماری ٹیم میں بہت زیادہ گروپ بندی ہے۔ مجھے دیکھ اور سن کر بہت تعجب ہوا کہ ین

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: آپ کی زندگی کو کوئی ایسا لمحہ جس میں آپ دوبارہ جینا چاہتے ہیں؟

حنیف محمد: میں زیادہ خواہشات نہیں رکھتا، میں بہت عاجز ہوں۔ اللہ میاں سے بس یہی دُعا ہے کہ مجھے اتنے پیسے دے تاکہ میں اچھا کھانا کھا سکوں، گھر کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ مجھے زیادہ پیسوں کی بھی طلب نہیں ہے۔

نعیم طاہر: 1959ءمیں آپ نے کراچی کے طرف سے کھیلتے ہوئے بہاولپور کے خلاف 499 رنز بنا کر فرسٹ کلاس کا ریکارڈ توڑا۔ اس میچ کے دیگر نمایاں کھلاڑیوں میں کون کون تھا؟

حنیف محمد: میرے بڑے بھائی وزیر محمد کپتان اور اس کے علاوہ علیم الدین، محمد مناف، WALLIS MATHIAS اور مشتاق محمد شامل تھے۔

نعیم طاہر: آپ کو آؤٹ کس نے کیا تھا؟

حنیف محمد: میں رَن آؤٹ ہوا تھا۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔ رَن آؤٹ۔

حنیف محمد: آپ نے ابھی 499 کہا۔۔۔

نعیم طاہر: جی۔ 499

حنیف محمد: میں آپ کو روکنے لگا تھا کہ یہ غلط ہے۔ اصل میں 499 and Half۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔۔۔

حنیف محمد: میں اسکور بورڈ کی وجہ سے غلط آؤٹ ہو گیا تھا۔ دراصل اسکور بورڈ پر 496 رنز لگا دیے۔ جبکہ میرے 498 رنز تھے۔ مجھے علم ہوتا تو میں پانچویں گیند پر رَن نہ بناتا اور آخری گیند پر دو رنز کی کوشش کرتا۔

نعیم طاہر: اگر وقت آپ کو ان دو رنز والے لمحات میں جانے کا دوبارہ موقع دے تو کیا آپ جائیں گے؟

حنیف محمد: آپ کہیں گے تو ضرور۔۔۔

☆☆☆

اختتامیہ:

حنیف محمد صاحب میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت ہمارے ناظرین کے لیے نکالا۔ میرے خیال میں ہر ذرّہ آفتاب ہے لیکن حنیف محمد کا رُتبہ دوسروں سے سوا ہے۔ آپ مستقبل کے کھلاڑیوں کے لیے انہماک، دلیری اور ثابت قدمی کی عمدہ مثال ہیں۔

ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے پرانی یادوں اور گزرے ہوئے تجربات کو تازہ کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کرکٹ کے میدانوں میں آپ سے بڑی ہمت اور حوصلے کی کوئی مثال دکھائی نہیں دیتی۔ پوری قوم آپ کی بلے بازی کی گرویدہ ہے۔ آپ کا نام تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

☆☆☆

ڈاکٹر احمد حسن دانی

ابتدائیہ:

ناظرین، میں اس پروگرام ''اِن کیمرا'' میں پہلے بھی تذکرہ کرتا رہا ہوں کسی قوم کے ماضی کے واقعات جیسے عرف عام میں تاریخ کہا جاتا ہے کسی بھی قوم کا قومی حافظ ہوتا ہے۔ تاریخ کے اوراق کو کبھی بھی نہیں بُھلایا جاسکتا۔

نوجوان نسل کی نظریاتی، علمی اور فکری پرورش کے لیے بھی ماضی سے واقفیت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ نوجوانوں کا رشتہ ماضی سے صالح خطوط پر استوار ہو جائے تو پھر معاشرہ دنیائے افق پر اپنا امتیازی تشخص قائم کرتا ہے۔

ہمارے پاس پورا نظریہ، نظام اور تابناک ماضی موجود ہے۔ ایسا تابناک کہ اس کی کرنیں ہر دور اور ہر زمانے میں جھلملاتی رہتی ہیں اور ہماری قوم میں زندگی کی روح پھونکتی ہیں۔ آج ہم ایک ایسی نابغۂ روزگار شخصیت کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، جنہوں نے تاریخ دان اور دانش ور کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل کی۔

ماضی بازیافت کرنے والے، نامور مفکر، مؤرخ، ماہر لسانیات، ماہر نشریات، ماہر آثار قدیمہ، دانش ور

Scanned with CamScanner

،گم گشتہ ،تہذیبوں کے رازداں، زندگی کے مختلف راستوں کے متلاشی ؛محترم ڈاکٹر احمد حسن دانی آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔

آپ کی اعلیٰ خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان نے ستارہ امتیاز سے نوازا۔آپ کی علم وبصیرت کا شہرہ مغربی دنیا میں ہوا تو امریکہ، برطانیہ، فرانس اور آسٹریلیا کے علاوہ جرمنی اور اٹلی میں بھی اعلیٰ ترین تعلیمی، تدریسی اور شہری اعزازات سے نوازا گیا۔

میں اپنے آج کے پروگرام میں دل کی گہرائیوں سے ڈاکٹر احمد حسن دانی کوخوش آمدید کہتا ہوں۔آیئے ناظرین دانی کی کہانی دانی کی زبانی سنیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: بہت بہت شکریہ آپ کا۔

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب، میں جب آپ کے کمرے میں داخل ہوا تو یہاں موجود جس چیز پر بھی نگاہ پڑی، ایسا محسوس ہوا کہ کسی حکومت یا ملکی سربراہ نے آپ کی خدمت میں پیش کی ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔

نعیم ڈاکٹر صاحب میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کی خدمات نے ہمارے ملک کی قدرومنزلت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ابھی 2003ء میں ترکی کے صدر نے آپ کی تحقیق وعلمی مساعی کے اعتراف میں OIC(Organization of Islamic Conference) کی جانب سے IRCICA کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی ایشیاء کی پہلی شخصیت ہیں جنہیں اس ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ہاں۔

نعیم طاہر: ورنہ اس سے پہلے یہ ایوارڈ امریکہ اور یورپ کے مؤرخین کو دیے جاتے تھے۔ڈاکٹر صاحب آپ پہلے واحد مسلمان گریجویٹ تھے۔جنہوں نے بنارس یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں ایم۔اے کی ڈگری اس شان سے حاصل کی کہ کوئی بھی آپ سے برتری نہ حاصل کر سکا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اول بدرجہ اول۔

نعیم طاہر: یہ سرگزشت ہمارے ناظرین کو بھی سنائیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ہم کشمیری الاصل تھے۔میرے والد صاحب کا کلکتہ اور ناگپور میں کاروبار تھا۔

نعیم طاہر: جی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جب میں امرتسر سے وہاں گیا تو میرے والد صاحب کہنے لگے کہ تم امرتسر میں فارسی واردو پڑھتے تھے لیکن یہاں تم کو ہندی اور سنسکرت پڑھنا پڑھے گی۔

میں نے کہا! آپ مجھے گھر میں کوئی استاد رکھوادیں جن سے میں ہندی سیکھ سکوں۔ میرے والد صاحب نے گھر میں ہندی پڑھانے کے لیے ایک استاد مقرر کر دیا اور وہ مجھے ہندی پڑھانے لگا۔

اس کے بعد میں شہر چلا گیا اور Saint Paul Central High School میں داخلہ لیا۔

نعیم طاہر: جی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اُنہوں نے کہا کہ یہاں تو ہندی لازمی ہے تم مسلمان یہاں کیسے آگئے۔

نعیم طاہر: اوہو اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے کہا کہ جی میں مسلمان ضرور ہوں لیکن میں نے ہندی پڑھی ہے۔ اچھا! ہندی پڑھ لیے ہو تو امتحان دو گے۔ میں نے کہا۔ جی! بالکل آج ہی امتحان لے لیں۔ میرے ساتھ ایک ہندو لڑکا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ ہم تم دونوں کا امتحان لیں گے۔

میں نے کہا! جی بالکل لے لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ خیر انہوں نے ہمارا امتحان لے لیا۔

ہمارا پرچہ چیک ہونے کے لیے بیرونی ممتحن کے پاس کلکتہ بھیجا گیا۔ کیونکہ اس یونیورسٹی میں اندرونی ممتحن پرچہ چیک نہیں کرتا تھا۔ اُس وقت جن طالب علموں نے بھی امتحان دیے سب کے پرچے چیک ہونے کے لیے کلکتہ بھجوائے گئے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ کلکتہ بھجوایا گیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جب اس پرچے کا نتیجہ آیا تو اس نے مجھے کہا کہ تمہیں تو 100 میں سے 99 نمبر ملے۔

نعیم طاہر: 100 میں سے 99۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی 100 میں سے 99۔

نعیم طاہر: ماشاءاللہ۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے کہا۔ جی اللہ تعالیٰ کی بڑی مہربانی کہ اتنے نمبر دیے۔

نعیم طاہر: جی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں جب ڈھاکہ میں تھا تو مجھے وہ استاد ملے اور کہنے لگے کہ میں دیکھ رہا تھا کہ نمبر کہاں سے کم کروں۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: مجھے کوئی غلطی نہ ملی تو میں نے خوش خطی کا ایک نمبر کاٹ لیا۔ ہاہاہاہا۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اس لیے میں نے تم کو 100 میں سے 99 نمبر دیے۔

نعیم طاہر: آپ نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ آپ سنسکرت کی ایک گردان یاد کرتے تھے اور پھر بھول جاتے تھے۔

ڈاکٹر احمد حسن جی بالکل۔ میں گردان گھر سے یاد کر کے جاتا تھا۔ لیکن اگلے روز کلاس میں جب پنڈت کا مُنہ دیکھتا

تھا تو بھول جاتا تھا اور مجھے یاد ہی نہ آتی تھی۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: وہاں پر مسلمان کو پٹھان کہتے تھے۔ تو پنڈت جی کہنے لگے کہ پٹھان کبھی سنسکرت پڑھ ہی نہیں سکتا۔ میری کلاس سے باہر ہو جاؤ۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے کہا۔ سَر میں بالکل یاد کر کے آیا تھا لیکن جب آپ کا چہرہ دیکھتا ہوں تو سب بھول جاتا ہوں۔ خیر دوسرے دن میں نے اپنے ایک ہندو برہمن ہم جماعت سے کہا کہ یار تم سنسکرت گردان سکھاؤ۔ اس نے مجھے وہ زبان سکھائی۔ رامہا رام رامین رامائے رامات رام رسیا ہے رام۔

نعیم طاہر: کیسے۔ ذرا پھر کہیے گا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: رامہا۔ رام۔ رامین۔ رامائے۔ رامات۔ رام رسیا ہے رام۔

اس طرح سے اس کا DECLENSION ہوتا تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: تو اس ہندو لڑکے نے کہا کہ بھائی ایک کام کرو میں اگلی نشست پر بیٹھوں گا تم میری پچھلی کُرسی پر بیٹھنا۔ جب پنڈت جی تم سے پوچھیں گے کہ اس کا DECLENSION کرو تو پنڈت کی جانب بالکل نہ دیکھنا بلکہ میری طرف دیکھنا اور پڑھ دینا کہ اس کو DECLENSION کہتے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔ اگلے روز صرف اس لڑکے کی منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پنڈت جی ہمیشہ کی طرح مجھے کہا کہ رام کی DECLENSION سناؤ۔

نعیم طاہر: جی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں اُس لڑکے کی طرف منہ کر کے ساری گردان دُہرا دی۔ تو پنڈت جی کہتے آج پٹھان یاد کر کے آیا ہے۔

نعیم طاہر: ہاہاہاہا۔ اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں بنارس یونیورسٹی میں پہلا واحد مسلمان تھا۔ جس نے ایم۔ اے پاس کیا۔ سنسکرت بھی

Scanned with CamScanner

میں نے کہا کہ سر تاج محل دکھانے میں تو کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے لیکن میں فرانسیسی نہیں جانتا۔ میں اُن سے کیسے گفت و شنید کروں گا۔

نعیم: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: کہنے لگے آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ آپ انگریزی زبان بولتے رہے ہیں۔ وہ بھی انگریزی جانتے ہیں لیکن انگریزی بولیں گے نہیں۔ آپ تاج محل سے متعلق ہر طرح کی معلومات انگریزی زبان میں بتائیں۔ وہ سمجھ جائیں گے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے صدر صاحب کو پورا تاج محل دکھایا۔ اور مجھے کہنے لگے کہ تاج محل کی آرائش و زیبائش فرانسیسی باشندوں نے کی ہے۔

میں نے کہا! سر یہ فرانسیسی باشندوں نے نہیں بنایا۔ یہ فن تو فرانس اور یورپ میں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا۔ تاج محل کی عمارت، آرائش و زیبائش، نقش و نگار مسلمانوں کی بنائی ہوئی ہے۔ کسی بھی فرانسیسی باشندے کا اس میں دخل نہیں ہے۔

صدر صاحب کہنے لگے! نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی اپنی بات پر بضد تھے۔

نعیم طاہر: اڑے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اپنی چھڑی کو زور سے مارتے ہوئے کہتے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا میں فرانسیسی باشندوں کے علاوہ اور کوئی نہیں بنا سکتا۔ میں نے پھر کہا! سر اس زمانے میں تو فرانس کے لوگوں کو اس فن کا علم ہی نہیں تھا۔ یہ فن تو ہمارے ان لوگوں کی میراث ہے جو سینٹرل ایشیاء سے یہاں آئے تھے۔

لیکن صدر صاحب نہیں مانے۔

نعیم طاہر: نہیں مانے۔ ہاہاہا۔۔۔ CHARLES DE GAULLE کے یہی عادات تھیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ہاں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ڈاکٹر صاحب، جب آپ پاکستان آئے تو آپ نے علمی و تحقیقی کاوشوں کا سلسلہ جاری رکھا؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ہاں۔ جب میں ڈھاکہ میں مقیم تھا تو وہاں میری ملاقات ایوب خان سے ہوئی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میرے ایک دوست کرنل نے کہا کہ تمھیں ایوب خان سے ملنا ہے؟ تو میں نے کہا! میں تو اُن

کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ کرنل صاحب کہنے لگے وہ بھی مکھی مار رہے ہیں چلیں آپ بھی وہیں آ جائیں۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔ اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: تو کرنل صاحب، مجھے ایوب خان کے پاس لے گئے اور میرا تعارف یوں کروایا کہ میں آثارِ قدیمہ (Archeologist) ہوں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ایوب خان صاحب نے مجھے چار گھنٹے اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ دنیا بھر کی آثار قدیمہ سے متعلق پوچھ گچھ کرتے رہے۔ میں بتاتا بھی رہا اور ساتھ میں چائے اور اس کے لوازمات سے بھی لطف اندوز ہوتا رہا۔

نعیم طاہر: ایوب خان صاحب کو دلچسپی تھی؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اُن کو بہت دلچسپی تھی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: وہ جب صدر بن گئے۔ تو اُس زمانے میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر محمد علی اُن کے دوست تھے۔ ایوب خان صاحب نے ان سے کہا کہ میں ڈھاکہ میں ایک شخص سے ملا ہوں اُس کو تم پشاور یونیورسٹی بلاؤ۔ میرا نام وہ بھول گئے تھے۔ ہاہاہا۔۔۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہا۔۔۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر محمد علی نے میرا پتہ معلوم کیا اور مجھے خط لکھا کہ صدر ایوب خان صاحب چاہتے ہیں کہ آپ یہاں آ جائیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں اپنی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین صاحب کے پاس گیا۔ شاید آپ نے ان کا نام سُنا ہو۔

نعیم طاہر: جی جی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اُن سے گزارش کی کہ مجھے پشاور یونیورسٹی سے نوکری کی پیش کش ہوئی ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین صاحب کہنے لگے کہ آپ بنگال چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ اور آپ کی بیگم دونوں

Scanned with CamScanner

بنگالی بولتے ہیں اور آپ بنگال چھوڑ کر پشاور جانا چاہتے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ٹھیک۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے کہا! ایک نہ ایک دن تو جانا ہی پڑے گا۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم پشاور چلے جاتے ہیں۔

اُنہوں نے کہا ایک کام کرو۔ استعفیٰ نہ دو۔ چھ مہینوں کی چھٹی پر چلے جاؤ۔ اگر تمہارا دل پشاور میں لگ جائے تو استعفیٰ دے دینا۔

میں نے کہا! آپ کی بہت مہربانی۔ ہم آپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے چھ مہینے کی چھٹی لے کر پشاور چلے جاتے ہیں۔ پھر پشاور یونیورسٹی میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد میں نے استعفیٰ دے دیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے پہلی بار پشاور یونیورسٹی پاکستان میں شعبہ آثار قدیمہ کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس سے قبل یہ شعبہ حکومت پاکستان کا حصہ تھا۔

نعیم طاہر: کیا آپ نے Mortimer Wheeler کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی۔ وہ تقسیم سے پہلے میرے استاد رہ چکے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے ان کے ساتھ دہلی، آگرہ، میسور میں بھی کام کیا اور سب جگہ کھدوائی (Exvacation) بھی کی۔

نعیم طاہر: اور یوں آپ کی آثار قدیمہ میں دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ Alexander Cunningham تو پہلے دور کے تھے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: وہ زندہ نہیں تھے مر چکے تھے۔ لیکن وہ Moretimer Wheeler کے مارشل تھے۔

نعیم طاہر: جی ٹھیک۔

ڈاکٹر احمد حسن اُس وقت وہ حیات تھے لیکن ریٹائرڈ ہو کر انگلینڈ چلے گئے تھے میری ان سے انگلینڈ میں ملاقات ہوئی تھی۔

نعیم طاہر: اچھا ڈاکٹر صاحب، آپ نے شعبہ آثار قدیمہ پشاور یونیورسٹی میں قائم کر دیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی پشاور یونیورسٹی میں شعبہ آثار قدیمہ متعارف کروایا لیکن جب میں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد چلا گیا تو برِصغیر پاک و ہند میں پہلی بار وسطی ایشیاء کی تاریخ پڑھانا شروع کی۔

نعیم طاہر: وسطی ایشیا کی تاریخ۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: قبل اس کے کوئی بھی وسط ایشیا کی تاریخ نہیں پڑھاتا تھا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُس وقت ہمارے وائس چانسلر رضی الدین صدیقی ہندوستان میں علم الریاض (Mathematics) کے بہت بڑے سائنسدان تھے۔ تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اور جب پیرس میں میٹنگ ہوتو مجھے اپنے ہمراہ لے جاتے اور مجھے کہتے تھے کہ میں خاموش بیٹھا رہوں گا تو تم گفتگو کرتے رہنا۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔ چھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں پیرس کا ایک واقعہ سُناتا ہوں۔

نعیم طاہر: جی ضرور۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: وہاں ایک فرانسیسی پروفیسر تھے۔ جو کہ فرانس کی سب سے بڑی اکیڈمی Academia Francaise کے صدر تھے۔ دُنیا بھر سے محدود تعداد میں اکابرین اس کے رکن منتخب ہوئے ہیں۔ اُن میں سے میری UNESCO کی میٹنگ میں بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ایک بار وہ وسطی ایشیاء کی تاریخ پر لیکچر دے رہے تھے۔ تو میں نے ہاتھ اُٹھایا۔ تو ڈائریکٹر جنرل یونیسکو نے مجھ سے استفہام کیا کہ آپ نے ہاتھ کیوں اٹھایا۔

میں نے کہا! یہ پروفیسر صاحب ایشیاء کی تاریخ سے بالکل واقف نہیں یہ تمام معلومات غلط بہم پہنچا رہے ہیں۔ میں ایشین ہوں، میں وسطی ایشیا کی تاریخ کا ماہر ہوں۔ آپ مجھ سے چین، جاپان، ہندوستان، پاکستان اور ایران کی تاریخ پر سوال پوچھ سکتے ہیں۔ آپ مجھے پانچ یا دس منٹ کا وقت دیں میں پروفیسر صاحب کے دیے گئے لیکچر کی تصحیح کر کے درست تاریخ سے آپ کو آگاہ کر دوں گا۔

اُنہوں نے کہا! آپ کے پاس دس منٹ کا وقت ہے۔ سب میری بیان سے بہت متاثر ہوئے۔ فرانسیسی پروفیسر صاحب کہنے لگے کیا آپ ہماری اکیڈمی میں آسکتے ہیں؟

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہا۔۔۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے کہا! سر مجھے فرانسیسی آتی تو نہیں لیکن اتنی فراوانی نہیں جیسا کہ آپ بولتے ہیں۔ اگر

آپ مجھے انگریزی میں گفتگو کرنے کا موقع دیں تو میں آنے کو تیار ہوں۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: وہ کہتے کہ ہماری ACADEMIA FRANCAISE میں فرانسیسی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے کہا!سَر ، میں پھر نہیں آسکتا۔

وہ کہتے، آپ کا آنا بہت ضروری ہے کیونکہ آپ نے مجھے تنقید کا نشانہ بنایا، اب میری باری ہے۔

میں نے کہا کہ ایک شرط ہے کہ اگر آپ مجھے انگریزی میں بات کرنے کی اجازت دیں۔

خیر انہوں نے مجھے آنے کی اجازت دے دی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں نے فرانسیسی زبان میں اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور دس منٹ بعد انگریزی زبان میں بات چیت کا سلسلہ شروع کردیا۔

نعیم طاہر: بہت خوب۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: یوں تاریخ میں پہلی مرتبہ ACADEMIA FRANCAISE میں انگریزی زبان میں گفتگو کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ڈاکٹر صاحب آپ کو کتنی زبانیں بولنا جانتے ہیں؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: بنگالی زبان سے لے کر پشتو زبان تک۔ میں جنوبی ہندوستان کی ساری زبانیں بولنا جانتا ہوں۔

نعیم طاہر: اور یورپی زبانیں؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: یورپ کی فرانسیسی، انگریزی، اطالوی اور روسی زبانیں بول سکتا ہوں۔

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب، آپ کی کتابیں تو یونیسکو نے بھی شائع کی ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ہاں، نہ صرف یونیسکو بلکہ جاپان اور ہندوستان سے بھی شائع ہوئی ہیں۔

نعیم طاہر: آپ کی تحریر کردہ کتب کی ایک طویل فہرست ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: آپ کو سُن کر یہ تعجب ہوگا کہ میری ایک کتاب Indianpalaeo

Clarendon/Oxford University Press نے شائع کی۔

اس کتاب میں شمالی ہندوستان سے لے کر جنوبی ہندوستان تک کا قدیم تحریری نظام Ancient Writing Systems اور قدیم مخطوطات کے صحیح زمانے اور وقت کی تاریخ درج ہے۔

نعیم طاہر: کیا انسانی تہذیب کا آغاز اس وقت سے ہوا جب انسان خوراک اور شکار کی تلاش میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں ہجرت کرتے رہتا تھا؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ایک وقت آیا کہ انسان نے خوراک کے لیے جگہ جگہ پھیرنے کی بجائے دریاؤں کے کنارے مستقل سکونت اختیار کرلی اور کھیتی باڑی کے ذریعے خوراک حاصل کرنے لگا۔ یہ انسان کی زندگی کا بہت بڑا انقلاب تھا اور یہاں سے انسانی تہذیب کا آغاز ہوگیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ماہرین نے انسانی تہذیب کے تین اہم اوائل قدیم مراکز دریافت کیے ان میں سے ایک ہمارے یہاں مہر گڑھ (وادی سندھ تہذیب) وادی نیل (مصر) اور دجلہ اور فرات کی سرزمین۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ان کی دریافت 7000 (قبل مسیح) کے لگ بھگ ہے۔

نعیم طاہر: 7000 (قبل مسیح) کا مطلب نو ہزار سال پہلے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی نو ہزار سال پہلے کی بات ہے۔

نعیم طاہر: کیا برِصغیر پاک و ہند کی ترقی یافتہ اور شاندار قدیم تہذیب وادی سندھ کی تہذیب (Indus Civilization) تین ہزار قبل مسیح (3000 قبلِ مسیح) دریافت ہوئی؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: سب سے پہلے سر جان مارشل (Sir John Marshall) نے اس کی کھدائی کی اور اس نے 3000 (قبل مسیح) کا عہد بتایا۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: لیکن آج ہم نے تحقیق سے یہ ثابت کردیا کہ یہ تہذیب 5000 (قبل مسیح) دریافت ہوئی۔

نعیم طاہر: آپ ہڑپہ (Harrapa) کو کیا مقام دیں گے؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ہڑپہ (Harrapa) اور موہن جوڈارو (Mohenjo Daro) ہم عصر ہیں۔

نعیم طاہر: لیکن اس کا ایک اہم حوالہ تو ہڑپہ تہذیب کے طور پر بھی دیا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ہڑپہ تہذیب کا نام تو لوگوں نے دیا ہے۔ لیکن ہم اس کو وادی سندھ کی تہذیب (Indus Civilization) ہی کہتے ہیں۔

نعیم طاہر: پہلے ہڑپہ تہذیب دریافت ہوئی یا موہن جوداڑو؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: دونوں تہذیبیں لگ بھگ ایک ہی وقت میں دریافت ہوئیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ہاہاہا---

ڈاکٹر احمد حسن دانی: انیسویں صدی میں برطانوی ماہر آثار قدیمہ Alexander Cunningham نے ہڑپہ اور موہن جوداڑو کو دریافت کیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ ڈاکٹر صاحب اب کچھ بات "وادی سندھ کی تہذیب" کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اس میں ایک مبہم پہلو یہ ہے کہ آپ کے خیال وادی سندھ کی تہذیب سے متعلق سب سے بڑا معمہ یہ ہے کہ اس کے رسم الخط کو پڑھنے میں آج تک کامیابی نہیں مل سکتی؟ جو ہمیں مہریں اور ٹیبلٹ ملی ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اس کو ہم کہتے ہیں۔ تاریخی دور (Pre-Historic Period) لیکن موہن جوداڑو سے ہمیں مہریں، ٹیبلٹ، زبان کی علامتیں اور رسم الخط کے آثار ملے ہیں۔

نعیم طاہر: یہی بات میں کہہ رہا ہوں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: مگر آج بھی دنیا بھر کے محققین اس قدیم تہذیب کا رسم الخط سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔

نعیم طاہر: لیکن موہن جوداڑو رسم الخط پر تحقیق کرنے والے ماہر آثار قدیمہ Dr. Asko Parpola نے اس پر بہت کام کیا ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں اس کی تحقیقی شواہد سے متفق نہیں ہوں۔ میں نے Asko Parpola کو کہا بھی کہ تم نے اس پراسرار زبان کے رسم الخط کو غلط پڑھا ہے۔

نعیم طاہر: Asko Parpola کے خیال میں تو اس تہذیب کے آبادکار دراوڑ (Dravidian) نامی نسل کے لوگ ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میں اُن سے یہ کہتا ہوں کہ اگر دراوڑ نامی نسل کے لوگوں نے اس تہذیب کو آباد کیا تو جب وہ جنوبی ہندوستان گئے تو اپنے ہمراہ کچھ تو لے گئے ہوں گے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جنوبی ہندوستان میں تو ہمیں وادی سندھ کی تہذیب کے کوئی آثار نہیں ملے۔

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے گفتگو کے دوران بتایا تھا کہ کھدائی کرتے ہوئے آپ کو وہاں سے ڈھولک بھی ملی؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ڈھولک سب سے پہلے موہن جوداڑو سے ملی۔

نعیم طاہر: اور جنوبی ہندوستان میں؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: وہاں تو بعد میں ملی تھی۔

نعیم طاہر: اُس زمانے میں کھدائی کے دوران کوئی ایسی چیز بھی ملی جو موہن جوداڑو اور جنوبی ہندوستان میں مشترک ہو؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اُس عہد کی تو نہیں ملی۔

نعیم طاہر: لیکن روایت تو جنوبی ہندوستان سے آگے بڑھی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جنوبی ہندوستان اپنی کوئی تہذیب نہیں تھی۔ بہت سے ماہر آثار قدیمہ ASKO PARPOLA اور IRAVATHAM MAHADEVAN دعویٰ کرتے ہیں کہ موہن جوداڑو تہذیب کے آبادکار جنوبی ہندوستان والے تھے۔

میں نے کہا کہ پھر وہ جاتے ہوئے یہاں سے کیا لے گئے کھانا پینا، رہن سہن یا لباس یا رسوم ورواج وغیرہ؟

نعیم طاہر: اچھا یہ بتائیے کہ کسی بھی تہذیب کی زبان، رسم الخط اور زبان کی علامتوں کا کیا طریقہ کار ہے؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: مصری تہذیب (Egypt) اور عراقی تہذیب (Mesopatamia) کی زبانوں کی رمز کشائی ہو چکی ہے۔ بالعموم ہمیں دو زبانوں کے آثار ملتے ہیں۔ ایک وہ جسے ہم جانتے ہیں اور دوسری زبان ہم نہیں جانتے تو ایسی زبان کی عبارتیں آسانی سے پڑھی جاسکتی ہیں۔ لیکن ایک زبان کی تعبیر قدرے مشکل ہے۔

اس کا بھی تحقیقی طریقہ ہائے کار Dr. Volver L. Menze نے واضح کیا ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ اس پر عمل کر کے وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ کیا آپ اس پر تحقیق کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی میں بھی کام کر رہا ہوں۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب مجھے لگتا ہے کہ آپ ہی اس میں کامیاب ہونگے۔ (مزاحیہ انداز میں)

ڈاکٹر احمد حسن دانی: بس دُعا کریں کی ہمیں کامیابی ملے۔

نعیم طاہر: یہ ایک بہت بڑی پیش رفت ہوگی۔

ڈاکٹر احمد حسن جی بالکل۔ اس پیش رفت سے ہمیں یہاں کے لوگوں کی شناخت معلوم ہوجائے۔

نعیم طاہر: ہمیں وادی سندھ کی تہذیب کے متعلق محکمہ آثار قدیمہ نے جتنی اہم اور مفید معلومات پہنچائی ہیں تو ان سے صاف واضح ہے کہ وادی سندھ (وادی دجلہ اور فرات کی تہذیب) سے جُڑی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ہاں۔ وادی سندھ کے اور مصر کے ساتھ سمندری اور زمینی سطح پر تجارتی تعلقات تھے۔ بالخصوص عراق میں ایک گاؤں MELLUHA وادی سندھ کے ایک گاؤں کے نام پر ہے۔

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب وادی سندھ کی تہذیب کے سَر بے شمار دریافتوں کا سہرا ہے جیسا کہ جہاز رانی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اس کا BRONZE AGE CIVILIZATION بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں لوہے کی بجائے کانسی کا استعمال کیا جاتا تھا۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: تانبا اور کچھ دوسری دھاتوں عموماً قلعی سے بننے والا مغلوبہ بھرت کانسی کہلاتا ہے۔

نعیم طاہر: کیا جہاز رانی بھی اس خطے کی ایجاد ہے؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی بالکل۔ جہاز رانی بھی اور اُن کا اپنا تحریری نظام۔ اگرچہ مصر اور عراق کا بھی اپنا رسم الخط تھا لیکن وادی سندھ کا اپنا مخصوص تحریری نظام تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔ جہاز رانی کے علاوہ سندھ تہذیب نے انسانوں کو گنتی بھی سِکھائی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی بالکل۔ یہ جو آج کل کی گنتی ہے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ یہ گنتی کا آغاز یہیں سے ہوا۔

نعیم طاہر: گنتی بھی اور اعشاریہ یعنی دس اور بارہ کی بنیاد کا اعدادی بھی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: یہ دونوں اُنہوں نے سِکھایا اور آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ وادی سندھ کی تہذیب صرف موہن جوداڑو میں ہی نہیں بلکہ ٹیکسلا سے مشرقی پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوستان میں اس کے آثار بالکل نہیں پائے جاتے۔

نعیم طاہر: سُنا ہے کہ اب تک تقریباً 142 شہروں میں وادی سندھ کی تہذیب کے آثار ملے ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی بلاشبہ۔

نعیم طاہر: کیا شعبہ موسیقی میں بھی اس تہذیب کی خدمات ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: نہ صرف موسیقی بلکہ رقص میں بھی۔

نعیم طاہر: دونوں میں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: بلکہ ہم کو تو مشہور ناچتی مرتی ''سمبارا'' کی بھی تصویر ملی ہوئی ہے۔

نعیم طاہر: موسیقی کی دُنیا کے دور ردھم KEHERWA اور چھ کی گنتی اس تہذیب کی ایجاد ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی بالکل ٹھیک۔ اس زمانے میں یہ تھے۔

نعیم طاہر: اور آج بھی یہ ردھم موسیقی کی بنیاد ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی بالکل KEHERWA اور چھ کی گنتی کا آغاز ہی اس تہذیب سے ہوا تھا۔

نعیم طاہر: اس تہذیب کے لوگ دو طریقوں سے تجارت کرتے تھے ایک سُمندری اور دوسری زمنی اور زمنی تجارت کا سلسلہ دوطرفہ تھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ہاں یہاں کے لوگوں کے عراق اور مصر کی تہذیبوں کے ساتھ تجارتی روابط قائم تھے، سمندری اور زمینی دونوں۔

نعیم طاہر: ایک اور تجارتی راستہ بھی تھا ''آمودریا'' (Amudarya) کی جانب سے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ہاں ''آمودریا'' جو آج کل ترکمانستان میں موجود ہے۔ وہاں بھی ایک قدیم شہر کے آثار مِلے ہیں جن کے تجارتی تعلقات وادی سندھ کی تہذیب کے ساتھ تھے۔

نعیم طاہر: اب میں ایک اہم پہلو کے متعلق آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ انسانی ڈھانچوں کی کھوپڑیوں سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس شخص کا تعلق کس ملک سے تھا۔
کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ ہجرت کس دور سے شروع ہوئی؟ کیا لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لیے زمینی راستہ اختیار کرتے یا سمندری راستہ؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: آپ کو میری یہ بات سُن کر تعجب یا خوشی ہوگی کہ کھدائی کے دوران ہمیں موہن جوداڑو سے چین کے لوگوں کی بھی کھوپڑیاں ملیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن میں کبھی کبھی چین کے سفارت کار سے کہتا ہوں کہ ہمارا اور چین کا تعلق صرف آج کا نہیں بلکہ پانچ

ہزار سال قبل کا ہے۔

نعیم طاہر: اس کا مطلب ہے کہ چھ یا سات ہزار سال پہلے.....

ڈاکٹر احمد حسن دانی: یہ لوگ کشمیر یا سنکیانگ (Xinjiang) کے راستے آئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خشکی اور سمندری دونوں راستے اختیار کرتے ہوں گے۔

نعیم طاہر: ڈاکٹر صاحب وادی سندھ کی تہذیب اپنے شہر کی تعمیر و وسیع کی بہترین منصوبہ بندی کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: وادی سندھ کے تمام شہر تعمیر و وسیع کی بہترین منصوبہ بندی (Town Planning) کے شاہکار کی پیداوار ہیں۔ شہر کا نقشہ، اس کے بساؤ کے طریقے، اس کی سڑکیں اور دیگر انتظامات کو دیکھ کر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کے باشندے، بہت ہی صفائی پسند، متمدن اور خوش باش تھے۔ ہر چوراہے پر ایک سڑک دوسری کو زاویہ قائمہ پر کاٹتی ہے۔ شاہراہوں کی چوڑائی 33 فٹ ہے۔ سڑکوں کے علاوہ بے انتہا کوچے اور گلیاں ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔ اور غسل خانے کا انتظام؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: مکانات میں غسل خانے اور پاخانے عموماً نچلی منزل پر تھے مگر بعض مکانات میں دوسری منزل میں بھی ان کے نشانات ملتے ہیں۔ گھروں کا گندا پانی باہر جانے کے لیے نالیوں کا انتظام ہے جن کی تعمیر میں حفظانِ صحت کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ غسل خانے اور پاخانے مکان کی حدود میں سڑک کی طرف واقع تھے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ہر مکان میں ایک غسل خانے کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں مٹی کے بڑے بڑے مٹکے رکھے ہیں۔ جن کو کنویں سے پانی سے بھر لیا جاتا تھا۔ اس سے لوٹے کے ذریعے پانی کو بدن پر ڈالتے تھے۔ لگتا ہے کہ لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے کھڑے ہو کر نہاتے تھے۔

نعیم طاہر: لیکن ان میں مختلف مذاہب کے پیروکار موجود تھے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اب تک جو اثری مواد ملا ہے۔ ان میں بے شمار مٹی کی مورتیاں جو زیادہ تر دیویوں کی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے مذاہب میں دیویوں کا تصور رہا تھا اور اہلِ سندھ ان کی پوجا کرتے تھے ان کو پنجی دیوی ماں کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان مذاہب میں ماں کی برتری کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن ہمیں وہاں کی

معبد کے آثار ملے۔

نعیم طاہر: اب میں آپ سے "آریا قوم" کے متعلق استفسار کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ یہ لفظ "آریا" صرف ان کی زبان کی ترجمانی کرتا ہوں اور اس کا کسی نسل یا قوم سے تعلق نہیں ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: آریا کے معانی سنسکرت میں "بلند مرتبہ" اور "معزز" کے ہیں۔ یہ معانی غالباً آریوں نے برصغیر میں اپنائے ہیں کیونکہ وہ مقامی باشندوں کو "پشاچی" یعنی کچا گوشت کھانے والے، "داس" یعنی غلام اور "دسّا" یعنی غیر کہتے تھے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں خود کو آریا کہتے تھے۔

نعیم: آریا سیلاب کی دو لہریں تھیں جو ایک کے بعد ایک آ رہی تھیں اور ان کا ترکِ وطن کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ وہ گروہ در گروہ کی شکل میں مختلف اوقات میں مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: آریاؤں کی ایک لہر تو ابھی بھی گلگت میں موجود ہے۔

نعیم طاہر: لیکن یہ دو ہزار قبل مسیح آئی تھی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ہاں بعد میں تقریباً 1500 (قبل مسیح) کے لگ بھگ آریان سرزمینِ افغانستان برصغیر میں داخل ہوئی اور پھر ہمارے ہمارے ملک پاکستان آئے۔ اس زمانے میں دریائے سندھ کی مناسبت سے اس کو "سندھو دیش" کہا جاتا تھا۔

نعیم طاہر: آریاؤں کا پاک و ہند کی سرزمین پر دور صدیوں تک جاری رہا اور ان کے مختلف قبیلے مختلف اوقات میں یہاں آباد رہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی ہاں جب یہاں آئے تو کھیتی باڑی کا بھی سلسلہ شروع کیا۔

نعیم طاہر: پاکستان کے کن شہروں میں آریائی نسل آج بھی آباد ہے؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: کشمیر، پنجاب، سرحد اور کافرستان میں۔ کافرستان کے لوگوں کو آریائی نسل کہا جاتا ہے۔ یہ مختلف قبائل کی صورت میں آباد تھے۔

نعیم طاہر: گھوڑے کو سدھانے کا ہنر بھی جانتے تھے؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: سب سے پہلے ہمارے ملک میں آریا ہی گھوڑا لے کر آئے موہن جو دڑو کے دور میں ہمارے پاس گھوڑا نہیں تھا۔

نعیم طاہر: انسانی تاریخ میں گھوڑے کو سدھانے کا آغاز بھی آریا ہی نے کیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی بالکل۔

نعیم طاہر: کیا رتھ بھی ان کی ایجاد ہے؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی۔ رتھ بنانے کا بھی ہُنر جانتے تھے۔ لیکن رتھ میں بنیادی چیز پہیہ ہے جو موہن جوداڑو میں پہلے سے موجود تھا۔

نعیم طاہر: جی ٹھیک۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ان پہیوں کی مدد سے آریاؤں نے ایک مختلف قسم کی گاڑی بنادی۔ پانی پت میں ہونے والی مہابھارت کی لڑائی میں بھی یہ گاڑی استعمال ہوئی۔ آریا جنگ کے داؤ پیچ لگاتے ہوئے وہ اس گاڑی پر بیٹھتے تھے۔ بھالے یا نیزے سے لڑائی کرنے سے بھی متعارف کرایا۔

نعیم طاہر: آریا اپنے ساتھ سنسکرت زبان بھی لائے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اس عہد کی سنسکرت آج کے دور کی سنسکرت سے مختلف ہے۔ کلاسیکل سنسکرت بولی جاتی ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: کلاسیکل سنسکرت کی لسانی صرف ونحو کے اولین ماہر "پانینی" ہیں۔ "پانینی" ایک قدیم سنسکرت، ماہر فلورو تو جسٹ، گرامر اور ہندومت کے ایک قابل عالم تھے۔ ان کے تیار کردہ سنسکرت زبان کی گرامر "استدیائی" جس میں سنسکرت صرفیات (Morphology) کے 3959 قواعد درج کیے گئے ہیں۔

نعیم طاہر: آریا نے یہاں غلبہ پالیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: آریا یہاں کے مقامی باشندوں کو داسو (Dasyua) داسا (Dasa) یا نشاد (Nishad) کہتے تھے، یعنی غلام اور حقیر جانتے تھے تو ان لوگوں پر حاوی ہوگئے۔ یہیں آکر انہوں نے اپنی مذہبی کتاب "رگ وید" لکھی۔

نعیم طاہر: کیا آریاؤں نے یہاں کے مقامی باشندوں سے شادیاں بھی کیں؟

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی بالکل شادیاں بھی کی ہوں گی۔

نعیم وادی سندھ کی تہذیب کی تاریخ سے داس یا داسو قوم کا نام ونشان مٹنے لگا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اب آپ دیکھیں جب آریا آئے تو انہوں نے موہن جوداڑو کے شہر ٹیکسلا کو آباد کیا۔

نعیم طاہر:

اچھا۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی:

ٹیکسلا شہر کے زمانے میں موہن جوداڑو موجود تھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: لیکن آریا نے اس شہر کو نئے سرے سے آباد کیا۔ پڑھنے لکھنے کا رواج قائم کیا۔ جس کو آج کل ہم یونیورسٹی کہتے ہیں۔ دُنیا کی تاریخ کی پہلی یونیورسٹی ٹیکسلا میں قائم ہوئی۔

نعیم طاہر: جی ٹھیک۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: دُنیا بھر سے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ ہندوستان کا پہلا بادشاہ چندر گیت موریا بھی اس یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہا۔ پانینی بھی ٹیکسلا یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت دنیا کی تاریخ میں سب سے بلند ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ٹیکسلا کو سنسکرت زبان میں "تکشیلا" کہتے ہیں۔ تکشیلا دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ تکش اور شیلا۔

تکش کے معانی ہیں سانپ (Serpent)۔۔ شیلا کے معانی ہیں دارالحکومت (Capital)

آریا کی آمد سے قبل جو لوگ یہاں آباد تھے وہ سانپوں کی پرستش کرتے تھے۔

نعیم بہت خوب۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: یہ شہر ان کا دارالحکومت تھا۔ جس کے نام سے "تکشیلا" بنا۔

نعیم طاہر: ایک ہزار قبل مسیح کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ اس کے مطابق آریا اپنے ساتھ مرد دیوتا (Male God) کا بھی تصور لائے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: بالکل ٹھیک۔

نعیم طاہر: مثلاً اندرا اور اگنی وغیرہ۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: یہ تمام آریاؤں کے دیوتا تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ موہن جوداڑو میں دیویاں بھی تھیں۔

نعیم طاہر: اچھا اب اسی دور میں مرد دیوتا کا تصور فرعون کے ہاں بھی ہوا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔

نعیم طاہر: تقریباً وہی دور ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: قریب قریب وہی دور ہے۔

Scanned with CamScanner

نعیم طاہر: اسی دور میں مرد کی بالادستی (Male Supremacy) کے تصور کا بھی آغاز ہوا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آریا کی ایک شاخ تو بیماری کی طرح ہے جبکہ دوسری شاخ جدید ٹرکی سے نقل مکانی کر کے وہاں آباد ہوئی اور مرد دیوتا کے تصور کو فروغ دیا۔

نعیم طاہر: اب اس کے بعد وادی سندھ کی تہذیب معدوم ہوتی گئی اور ایک نئی آریائی تہذیب نے جنم لیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: اسے ویدک تہذیب کا نام دیا گیا۔

نعیم طاہر: "ویدک تہذیب" سے پہلے کچھ زمانی فاصلہ بھی آجاتا ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: پہلے، تو لوگ کہتے تھے کہ زمانی فاصلہ قائم ہوا لیکن اب نہیں ہے۔

نعیم طاہر: آپ نے اس کو مکمل کر دیا۔ ہاہاہاہا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ہاہاہاہا۔ وادی سندھ کی تہذیب کے آخری دور میں ہڑپہ میں ہمیں آریاؤں کے کچھ آثار ملے ہیں۔ سرجان مارشل کے زمانے میں نہیں ملے تھے۔ لیکن اب کھدائی کے دوران ہمیں کچھ آثار ملے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا ڈاکٹر صاحب یہ بتائیے کہ اس عہد میں آریاؤں اور وہاں کے مقامی باشندوں "داسو" کے ساتھ مذہب کی ایک نئی شکل تشکیل پاتی ہے۔ اور اس مذہب سے سب سے پہلے انسان کے درجات مقرر کر دیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی بالکل۔ سب سے پہلے آریاؤں نے اپنی ذات کو داسو سے برتر قرار دیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: داسو قوم کو انہوں نے "شودر" کا نام دے دیا۔

نعیم طاہر: جی ٹھیک۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جو آریا مذہب سے زیادہ قریب تھے، جیسے ہمارے ہاں مولوی صاحب مسجدوں میں نماز پڑھواتے ہیں۔ تو ایسے دیویوں سے قربت رکھنے والے لوگوں کو انہوں نے براہمن کا نام دے دیا۔

نعیم طاہر: جی درست۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی لوگ لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ کیا کرتے تھے۔ ان کو راجاتیہ (Rajatia) کا نام دے دیا اور کاروباری لوگوں کو ویشہ (Vysha) کہہ دیا۔

نعیم طاہر: جی بالکل۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: سنسکرت میں کہتے ہیں چار جاتیں۔ تو رگ وید کے عہد میں چار ذاتیں ہو گئیں تھیں۔

براہمن، راجاتیہ، ویشہ اور شودر۔

نعیم طاہر: اور "داسو" جو ان کی آمد سے پہلے ایک بہت بڑی تہذیب آباد کیے ہوئے تھے وہ اب مغلوب ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جس کو آجکل ہم داس (SLAVE) بھی کہتے ہیں۔

نعیم طاہر: وہ خوش تو نہیں ہوں گے ایک اجتماعی خفگی کا بھی تاثر برقرار رہا ہوگا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی بالکل خوش نہیں تھے۔ برہم بھی تھے لیکن آریاؤں نے اس خطے کو فتح کر لیا تھا۔ جیسے ہم اپنے گھروں میں نوکر رکھتے ہیں۔ داسو سے بھی وہ یہی کام لیتے تھے۔

نعیم طاہر: لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس بے عزتی کا غبار کبھی "بدھا" (Buddhist) کی صورت میں نکلتا ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: پھر اس کے بعد اسلام آتا ہے۔

نعیم طاہر: دوسرے لفظ صدیوں سے یہ ہر نئے آنے والے مذہب کو خوش آمدید کہتے ہیں اور آریاؤں کے تسلط کو رد کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: ہندوستان میں کوئی ہندو اس بات کو نہیں سمجھتا سوائے چند پڑھے لکھے لوگوں کے۔

نعیم طاہر: اچھا ڈاکٹر صاحب آپ کے خیال میں سب سے تازہ ترین دریافت کیا ہوئی ہے؟ اور کیا اس سے تحقیق کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: میرے خیال میں علم آثار قدیمہ میں سب سے جدید ترین دریافت آریاؤں کی بستیاں اور ان کی قبریں ہیں۔ اس کا کھوج مجھے تمل گڑھ سے ملا۔

نعیم طاہر: آپ نے دریافت کیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی: جی۔ میں نے اس کو دریافت کیا اور لوگوں کو بتایا کہ آریاؤں کا رہن سہن کیسا تھا۔ ان کے گھروں کا نظام اور اپنے مردوں کو کیسے دفن کرتے تھے۔ کیونکہ پہلے وہ دفن کرتے تھے، بعد میں مُردوں کو جلاتے تھے۔ آج سے بیس برس قبل میں اس کو دریافت کیا جب میں پشاور یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ پہلی بار لوگوں کو معلوم ہوا کے آریا کون لوگ تھے اور کہاں رہتے تھے، کیسے رہتے تھے، کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد میں شمالی علاقہ جات گلگت اور چلاس میں کھدائی کا کام شروع کروا دیا۔ ایک جرمن

Scanned with CamScanner

ناصر علی شاہ بُخاری

ابتدائیہ:

پاکستان کی معیشت دنیا کی چھبیسویں سب سے بڑی بلحاظ مساوی قوت خرید اور بلحاظ خام ملکی پیداوار بیالیسویں سب سے بڑی معیشت ہے۔ کسی بھی ملک کی معیشت میں اسٹاک مارکیٹ ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتی ہے۔ ہم نے آج کے پروگرام میں اسی موضوع کی مناسبت سے ایک ایسی شخصیت کو دعوت دی ہے جن کے والد محترم خادم علی شاہ بخاری صاحب نے ملکی معیشت کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

میری خوش قسمتی ہے کہ چند برس پہلے میری خادم علی شاہ بخاری صاحب سے بہت مختصر ملاقات ہوئی۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد وہ مستقل پاکستان میں آبسے۔ زندگی کی صعوبتوں اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے ایک کامیاب انسان قرار پائے اور پوری دُنیا کے لیے ایک مثالی شخصیت بن گئے۔ پاکستان کی اسٹاک مارکیٹ میں ICON کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔

باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُن کے بیٹے ناصر علی شاہ بُخاری صاحب بھی اس روایت کے امین بنے اور اپنی لیاقت سے اپنے والد کے نام کو مزید وقار بخشا۔

(Standard Chartered Bank) کی بالائی منزل پر سٹاک ایکسچینج کی اجازت تھی۔

نعیم طاہر: سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک چندری گر روڈ پر واقع تھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: جی بالکل۔ نیا نیا ملک بنا تھا۔ اُس وقت سٹاک ایکسچینج کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے تھے، صرف بمبئی یا کلکتہ سے ہجرت کر کے آنے والے صاحبان اس کا علم رکھتے تھے۔ ابھی حکومت پاکستان نے یہ بھی نہیں فیصلہ کیا تھا کہ کس قسم کی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کی جائے۔ اس وقت کاٹن ایکسچینج میں روئی (Ginning) کی فیکٹریاں یا کپڑے (Textile) کی فیکٹریاں بنیادی کمپنیاں تھیں۔ جب یہ کمپنیاں عوامی سطح پر امتیازی حیثیت حاصل کرنے لگیں تو وہ تمام حضرات جو کاٹن ایکسچینج میں شاہ صاحب سے رابطہ رکھتے تھے اُن کی خواہش تھی کہ آپ ہمارے ساتھ سٹاک ایکسچینج میں بھی کام کریں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اُن کمپنیوں کے مالکان چاہتے تھے کہ بخاری صاحب سروس کا جو معیار کاٹن ایکسچینج میں دے رہے ہیں۔ وہی معیار سٹاک ایکسچینج میں بھی برقرار رہے۔ خادم علی شاہ بخاری صاحب باقاعدہ طور پر 1959ء میں سٹاک ایکسچینج کے رُکن بنے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: یہ وہ دور تھا جب ملک میں باقاعدہ طور پر صنعت کاری (Industrialization) کی کسی حد تک ابتداء ہو چکی تھی۔

نعیم طاہر: اس دور میں کیا اسٹاک ایکسچینج کی نئی عمارت کی تعمیر ہو گئی تھی یا ابھی سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک کی بالائی منزل پر ہی قائم تھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: سٹاک ایکسچینج کا دفتر ایک بیرک (Barrack) میں منتقل ہو گیا تھا۔

نعیم طاہر: تو خادم علی شاہ بخاری صاحب بھی اُسی بیرک میں بیٹھتے تھے۔ (مزاحیہ انداز میں)۔۔۔

ناصر علی شاہ بُخاری: جی۔

نعیم طاہر: کیا وہ بیرک ابھی بھی ہے؟

ناصر علی شاہ بُخاری: جی بیرک ابھی بھی موجود ہے۔ اس میں کچھ تبدیلیاں بھی آئیں۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ جب اسٹاک ایکسچینج کی نئی عمارت تعمیر ہوئی اور ماشاء اللہ اب تو اس میں بہت خوبصورت دفاتر بھی

ہیں۔ لیکن اس بیرک کو سٹاک ایکسچینج نے آج بھی قائم رکھا ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: خوش قسمتی سے اُن کا پہلا کمرہ نمبر بیاسی (82) اب تک موجود ہے۔

نعیم طاہر: کیا کمرہ نمبر بیاسی کے باہر خادم علی شاہ صاحب کا نام لکھا ہوا ہے؟

ناصر علی شاہ بُخاری: جی اور اس میں ایکسچینج کا کاروبار بھی ہو رہا ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔ اب بھی ہو رہا ہے۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اس کمرے کو مکمل طور پر بند نہیں کیا گیا بلکہ بخاری منی کنورٹر (Bukhari Money Converter) کے نام سے وہاں پر کاروبار جاری ہے۔

نعیم طاہر: اچھا میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کاٹن ایکسچینج، اسٹاک ایکسچینج اور بعد ازاں ایک بروکر کا ملک کی صنعت کاری کے فروغ میں کیا کردار ہے تاکہ ہمارے ناظرین جان سکیں۔

ناصر علی شاہ بُخاری: دیکھیں جب صنعت کاری کا دور شروع ہوا تو اس وقت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری بنیادی ضرورت تھی۔ جو کمپنیاں اپنی سرمایہ کاری کی گئی رقم سے حصص نکالتی تھیں۔ یہ بنیادی سرمایہ کاری (Primary Capital) کہلاتا ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: جب معاملہ عوامی سطح پر آ جائے پھر IPO (Initial Public Offering) کی بات کرتے ہیں، اس کے باوجود یہ بنیادی معاملہ ہی رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد حصص یافتگان، ان حصص (Share) کی باقاعدہ خرید و فروخت کے لیے سٹاک ایکسچینج سے خرید و فروخت کی منڈی تشکیل دیتے ہیں۔ اس پورے عمل میں سٹاک ایکسچینج کے باقاعدہ ارکان اور بروکر بااختیار ہوتے ہیں۔ لیکن عمومی طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ شاید صرف خرید و فروخت ہی کر رہے ہیں۔

نعیم طاہر: جی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: بلکہ وہ اس کے علاوہ بھی بے شمار کام کرتے ہیں۔ مثلاً کہ کمپنیاں کیسے اپنی سرمایہ کاری بڑھائیں۔ ان کمپنیوں پر مکمل تحقیق کی جاتی ہے تاکہ ان کمپنیوں کے متعلق تفصیلی معلومات سرمایہ کاروں تک پہنچائی جائیں۔ اس کے علاوہ اُن کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے مطابق حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہیں کہ کس طرح ملکی معیشت میں سرمایہ کاری کو فروغ دیا جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ

Scanned with CamScanner

ساٹھ کی دہائی میں پاکستان کی بے شمار کمپنیاں پبلک ہوئیں۔ یہ پاکستان کا وہ سنہری دور ہے جب ہماری داخلی پیداوار (Gross Domestic Product) کی شرح 8% یا 9% بڑھ گئی تھی۔

نعیم طاہر: جی جی۔

ناصر علی شاہ بخاری: اس دوران میں سٹاک ایکسچینج کے ارکان اور بروکر کا کردار بہت فعال تھا۔ میں پوری مارکیٹ کی بات کر رہا ہوں کہ انہوں نے بڑی محنت سے اس نوزائیدہ ملک میں جس کی زندگی چودہ برس ہی تھی، اُس میں ایک مضبوط سرمایہ کاری کی بنیاد ڈالی۔ کبھی کبھی مجھے بھی حیرت ہوتی ہے کہ اتنی زیادہ سرمایہ کاری کی بنیاد ڈالی۔ کبھی کبھی مجھے بھی حیرت ہوتی ہے کہ اتنی زیادہ پیداواری اشیاء و آلات کی مارکیٹ میں تجارت ہوتی تھیں۔ عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کاروبار رسک مینجمنٹ (Risk Managenment) ایک بنیادی ضرورت ہے اس کے بغیر سرمایہ کاری نہیں ہو سکتی ہم جن چیزوں کو آج روزمرہ کی صورت میں دیکھتے ہیں وہ اُس وقت بھی مارکیٹ میں نظر آتی تھیں۔ 60 کی مارکیٹ میں ان اصول و قواعد کو نافذ کیا گیا تھا۔

نعیم طاہر: بخاری صاحب، میں یہ سمجھنا چاہ رہا ہوں، اپنے دیکھنے والے ناظر کے نقطۂ نظر سے بھی کہ ایک کاروباری شخص ہے جس کے اندر صلاحیت بھی موجود ہے اور کاروبار کرنے کی بہت اچھی منصوبہ بندی بھی کر رکھی ہے کہ کس طرح سے ایک منافع بخش کاروبار کیا جائے۔ لیکن سرمایہ نہیں ہے۔ اگر اس قسم کی کاروباری شخص کو یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ اسے مالی امداد مل سکتی ہے تو پھر اس ملک میں کاروبار ترقی ہو سکتی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟

ناصر علی شاہ بخاری: اگر میں تاریخ کے حوالے سے بات کروں تو 60 کی دہائی کی یہی مثال دوں گا۔ ممکن ہے کہ یہ زیادہ آسانی سے سمجھ آ جائے۔ یہ دور پاکستانی صنعت کاری کا سنہری دور ہے۔ اس میں سرمایہ سٹاک ایکسچینج نے مہیا کیا۔ چھوٹے چھوٹے حصص یافتہ نے مہیا کیے اور بقیہ مالی اداروں نے مہیا کیا تھا۔ آپ یوں کہیے کہ پورے ملک کی صنعت کاری کی بنیاد جس سرمایے سے ہوئی وہ اسٹاک ایکسچینج نے مہیا کیا تھا۔ پاکستان کی تاریخ کے بہت بڑے منصوبے جو بنیادی معیشت کے لیے ضروری ہیں مثلاً ٹیکسٹائلز، کھاد (Fertilizer)، کیمیائی مادہ، جہاز رانی وغیرہ کے سرمائے اسٹاک ایکسچینج نے مہیا کیا۔ اب آپ جیسے انفرادی کاروبار کے حساب سے بات کرتے ہیں تو یہ اتنا آسان نہیں ہے۔

نعیم طاہر: نہیں ہے۔

ناصر علی شاہ بخاری: ایک کاروباری شخص اُٹھے اور کہے کہ آج ہی اسٹاک ایکسچینج سے اپنا سرمایہ جا کے لے لوں۔ اس کے لیے ایک بنیاد بنانی پڑتی ہے۔ اس کے پاس کم از کم کچھ حصص یافت ہونے چاہیں جو اُس کو بنیادی سرمایہ مہیا کریں۔ جب ابتدائی سرمایا سے ملتا ہے تو وہ اپنے صنعتی منصوبے کو قائم کرنے کی حیثیت میں ہوتا ہے اور وہ قائم ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ہاں بے شمار ٹیکسٹائل صنعتیں صرف اسی لیے قائم ہو سکیں کہ اُن کو اسٹاک ایکسچینج سے سرمایہ مہیا ہوا۔ ٹیکسٹائل کی دنیا میں آج بھی بڑے بڑے نام ہیں جو ستر (70) کی دہائی میں بہت چھوٹے سرمائے سے شروع ہوئے تھے۔ آج اُن کی بہت بڑی بڑی ٹیکسٹائل کی فیکٹریاں ہیں۔

نعیم طاہر: بخاری صاحب، یہاں میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے کہ ہمارے ملک میں مل جل کر کاروبار کرنے کا کافی رُجحان ہے۔ مثال کے طور پر کاروبار کرنے کی حکمتِ عملی تیار کر لی جاتی ہے، پھر اس میں سہولیات، ممکنات، اس کے انتظامی امور اور عملی طور پر اس کا لائحہ عمل اور اس کی انتظامیہ پر مکمل بھروسہ کر کے سرمایہ کاری کی جاتی ہے، کیا یہ رجحان صرف خاندانی افراد پر ہی مبنی ہے یا عام لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے؟

آپ بنیادی سرمایہ کاری کی بات کر رہے تھے، اس مرحلے میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ کفیل اپنے اصول و ضوابط سرمایہ کاری یا قرض وغیرہ دے گا۔ اگر کاروبار کرنے کا خواہش مند فرد اپنے دوست احباب سے بھی پیسے نہ اکٹھے کر سکے تو اسٹاک ایکسچینج میں کوئی ایسا طریقہ کار ہے کہ وہ وہاں اپنے منصوبے کا لائحہ عمل پیش کرے اور قرض کی درخواست کرے۔

ناصر علی شاہ بخاری: دیکھیں اب تو بے شمار Venture Capital Firms اور Funds ManagementCompanies پاکستان میں بن گئی ہیں۔ جو چھوٹے پیمانے پر سرمایہ مہیا کرتی ہیں۔ اگر بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرنے کی بات ہے تو دیکھیں ہم WTO (World Trade Organization) کے زیر سایہ اپنا وقت گزار رہے ہیں۔ عالمی سطح پر کاروباری دُنیا میں مقابلے کی دوڑ ہے۔ ایک ایک منٹ میں عالمی سطح پر منڈیوں میں اشیاء کی قیمتیں تبدیل ہوتی ہیں۔ ہمارا انحصار بھی ان منڈیوں پر ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ حال ہی میں ہمارے ملک میں روئی (Cotton) کا بحران بڑھ گیا۔ اس کی سب سے بڑی

وجہ یہ ہے کہ نیویارک میں ایک گانٹھ روئی کی قیمت 84 سینٹ (Cent) کی بلند ترین سطح پر پہنچ گئی۔ ہمارے ملک میں اس کا یہ اثر ہوا کہ ہمارے یہاں قیمت 1200 روپے کے حساب سے ہوگئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم عالمی منڈیوں کے تقاضوں کو سمجھیں جس پر ہم اپنی سرمایہ کاری کی بنیاد رکھیں گے۔

نعیم طاہر: اب میں ناصر علی شاہ صاحب کی شخصیت کی جانب پھر سے لوٹتا ہوں۔ ان سے منسوب بونس واؤچر کے قصے کی اصل حقیقت کیا ہے؟

ناصر علی شاہ بخاری: 1962ء میں ایوب خان صاحب نے ایک جرمن ماہر معاشیات کے مشورے سے پاکستان میں بونس واؤچر اسکیم متعارف کروائی۔ یہ اسکیم برآمدات کو بڑھانے کے لیے بنائی گئی۔ اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ برآمد کنندہ تاجر جب اپنی اشیا کو برآمد کرتا تھا تو برآمدات کے لیے بھی بونس ملتا تھا۔ مثلاً اگر دس ملین ڈالر کی برآمدات تھیں تو دس ملین ڈالر کی درآمدات بھی ہو سکتی تھیں۔ بونس واؤچر اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ میں فروخت کر دیں تو برآمد کنندہ تاجر اس معیاری قیمت میں خرید لیتا تھا۔ [illegible] سطح پر جو درآمدات تھیں وہ اس کے علاوہ تھیں۔ یہ پاکستان کی برآمد کنندگان اور درآمد کنندگان کے لیے کاروبار بڑھانے کے بہترین مواقع تھے۔

نعیم طاہر: بخاری صاحب کا یہ بونس واؤچر بیچنے کے لیے کس سے فون کیا تھا؟

ناصر علی شاہ بخاری: ایک عام رواج تھا کہ قیمت فروخت کے وقت مارکیٹ دو یا تین آنے گھٹ جاتی ہے اور قیمت خرید کے وقت اس کی طلب کی بنیاد پر مارکیٹ بڑھ جاتی ہے۔ شاہ صاحب کے ارد گرد یار دوست پورے فون پر [illegible] تھے اور ساتھ ان کے تین آدمی بیٹھے ہوتے تھے جو مارکیٹ میں خرید و فروخت کے دوران تمام مارکیٹوں کے نرخ [illegible] ساتھ ساتھ بتا رہے تھے۔

ایک بہت بڑے سیٹھ [illegible] کا فون آیا۔ انہوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ میں [illegible] بونس واؤچر بیچنا چاہتا ہوں۔ [illegible] نہ ہوئی تھی۔ تو انہوں نے شاہ صاحب سے قیمت مانگی۔ شاہ صاحب نے مارکیٹ کی قیمت [illegible] بتائی اور [illegible] خریدنے کا کہا۔

[illegible] مارکیٹ کی قیمت [illegible] رہا ہے۔ [illegible] جب رقم کی ادائیگی کی بات ہوئی تو شاہ صاحب سے کہا کہ میں [illegible] پے آرڈر [illegible] وصول کرتا ہوں اور

بھی کرتا ہوں۔ تو آپ سے بھی پیسوں کا لین دین پے آرڈر پر ہی ہوگا۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

ناصر علی شاہ بخاری: اسی روز رقم کی ادائیگی ہوگی۔ دوسرے روز پھر یہی واقعہ ہوا۔ تیسرے روز انہوں نے شاہ صاحب کو خاص فون کیا کہ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بخاری: اس وقت شاہ صاحب نوجوان تھے۔ ان کی عمر بھی تقریباً تیس برس ہوگی۔ جب انہوں نے شاہ صاحب کو دیکھا تو کہنے لگے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کی عمر بہت زیادہ ہوگی آپ اپنے اصول و قواعد کے اتنے پابند ہیں کہ ان کی ذرا سی بھی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ لیکن مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی آپ نے مارکیٹ کے نرخ پر مجھ سے بونس واؤچر کیوں خریدا؟

نعیم طاہر: انہیں حیرت اس لیے ہوئی کہ لوگ مارکیٹ کے نرخ پر سودا کرتے ہیں۔ رقم کی ادائیگی کے بعد اس کی قیمت خرید کی شرح کم ہو جاتی ہے تو اس سے کچھ فائدہ ہو جاتا ہے۔

ناصر علی شاہ بخاری: نہیں صرف یہ بات نہیں بلکہ قیمت فروخت کے وقت مارکیٹ کا نرخ دو یا چار آنے کم ہو جاتا تھا۔ اس کا راز یہ تھا کہ شاہ صاحب نے مشرقی و مغربی پاکستان میں اپنے کاروبار کا جال بچھا رکھا تھا۔ ان کے نو یا دس دفاتر مختلف جگہوں پر سرگرم عمل تھے جہاں وہ بونس واؤچر کی خرید و فروخت کی تجارت کرتے تھے۔ تو شاہ صاحب کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ صرف اسٹاک ایکسچینج میں ہی لین دین کریں۔ وہ اپنے تمام ذرائع استعمال کرتے تھے اور یہ سہولیات کسی اور بروکر کو میسر نہ تھی۔

نعیم طاہر: بخاری صاحب کی سیٹھ صاحب سے ملاقات ہوئی......

ناصر علی شاہ بخاری: جب بخاری صاحب کی سیٹھ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ آپ تو بہت کم عمر دکھتے ہیں۔

سیٹھ صاحب کی والدہ حیات تھیں۔ تو لوگ ان کے پاس شکایت لے کر گئے کہ ہماری بچپن کی دوستی ہے ہمیں ان کی طرف کام نہیں ملتا۔

نعیم طاہر: برادری سے باہر کاروبار کرتے ہیں۔

ناصر علی شاہ بخاری: سیٹھ صاحب نے اپنی والدہ کو پورا قصہ سنایا اور کہنے لگے کہ اگر کوئی شاہ صاحب کی طرز پر کام کرے تو میں حاضر ہوں اور ضرور کام کروں گا۔

Scanned with CamScanner

ناصر علی شاہ بُخاری: جی بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔

نعیم طاہر: ہاہاہا۔۔۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اُنہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ اسٹاک ایکسچینج میں کیا تبدیلی لائیں گے۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ پہلی کارپوریٹ کمپنی ہم بنائیں۔ کمیٹی کے کچھ لوگ میری اس بات سے آمادہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے ایسی بات کی جس سے محسوس ہوا کہ ان کے ذہن بالکل جامد ہو چکے تھے کیونکہ اُس وقت تک اسٹاک ایکسچینج میں یہ رُجحان نہیں تھا۔

نعیم طاہر: کہہ دیجیے وہ بات۔ ہاہاہا۔ (مزاحیہ انداز میں)

ناصر علی شاہ بُخاری: اُنہوں نے کہا: Over a dead body

نعیم طاہر: اچھا اللہ اُن کو لمبی زندگی دے۔ آپ نے تو بنالیا۔ ہاہاہا۔۔۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اُس وقت اسٹاک ایکسچینج میں ایسے لوگ تھے جو کہ سمجھتے تھے کہ اس کی ضرورت ہے۔ مثلاً جہانگیر صدیقی۔

نعیم طاہر: جہانگیر صدیقی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: جی، جہانگیر صدیقی ہمیشہ میرے خیال کی تائید کرتے بلکہ خود بھی آگے بڑھ بڑھ کر اس میں حصّہ لینے کی کوشش کرتے لہٰذا اسٹاک ایکسچینج میں پہلی دو کمپنیاں خادم علی شاہ بُخاری لیمیٹڈ اور جہانگیر صدیقی کمپنی لیمیٹڈ قائم ہوئیں۔ Merril Lynch Company کا وفد پاکستان آیا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اُنہوں نے دیکھا کہ ہمارا تحقیقی کام میّسر تھا تو انہوں نے ہماری تحقیق دیکھ کر یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔

نعیم طاہر: جی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: آپ کو معلوم ہے کہ 1992ء تک پاکستان میں غیر مُلکی سرمایہ کاروں کو ہمارے مُلک میں سرمایہ کاری کی اجازت نہ تھی۔

نعیم طاہر: 1992ء سے۔

ناصر علی شاہ بُخاری: جی، اور بے شمار سرمایہ کار مُلک میں Fund Managers کی جانب سے آیا۔

نعیم طاہر: آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سرمایہ کاری، خاص طور پر غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے کیا

اقدامات کرنے چاہیں کہ ملکی معیشت میں تیزی سے اضافہ ہو اور رُکاوٹیں ختم ہوں؟ آپ اپنے تجربات کی روشنی میں واضح کریں۔

ناصر علی شاہ بُخاری: آپ ہمیشہ سُنتے ہیں کہ ہماری سرمایہ کاری کی پالیسی بہت اچھی ہے اور یقین جانیے بہت اچھی ہے۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اچھا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اگر میں پاکستان کا ایشیا کے دوسرے ممالک سے موازنہ کروں تو پاکستان میں سرمایہ کاری کے بے شمار مواقع ہیں۔ اور حکومتی سطح پر بہت شاندار پالیسی بنائی گئی ہے۔ لیکن ایک اہم بات جس کو ہم نے نظر انداز کیا ہوا ہے وہ سرمایہ کاری کے لیے سازگار ماحول کی فراہمی نہیں ہے۔ ہم اس کی جانب توجہ مبذول نہیں کرتے۔

نعیم طاہر: ماحول۔۔۔

ناصر علی شاہ بُخاری: ماحول میں کئی عوامل شامل ہیں۔ اگر ایک کمپنی کسی بڑے منصوبہ پر کام کرنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ کمپنی اس سرمایہ سے کسی اور کمپنی میں سرمایہ کاری نہیں کر سکتی۔ اب یہ حیرت انگیز بات لگتی ہے۔

نعیم طاہر: ٹھیک ہے۔ عجیب سی بات لگتی ہے۔

ناصر علی شاہ بُخاری: کیونکہ ساری دُنیا میں جو تشکیل سرمایہ (Capital Formation) ہے۔ بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کارپوریشن ہی کرتی ہے، اور وہ ہولڈنگ کمپنی بن جاتی ہے۔

نعیم طاہر: بالکل۔

ناصر علی شاہ بُخاری: پاکستان میں ان پر ٹیکس لاگو کر کے حوصلہ شکنی کر دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ٹیکس کا نظام ایسا ہے کہ اگر کوئی ہولڈنگ کمپنی بنے گی تو ماتحت اداروں، کارپوریٹ آمدنی، حصّہ داری اور خود اُس پر بھی ٹیکس لاگو کر دیا جاتا۔ حصص یافتہ کے حصّہ داروں پر بھی یہ ٹیکس۔ اتنے ٹیکس لگتے ہیں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: موجودہ کارپوریٹس اس جانب توجہ مبذول نہیں کرتیں۔ یہ اُس صورت میں کہ سو فیصد سبسڈی (Subsidy) بنتی ہے۔ لیکن اگر وہ سو فیصد نہ ہو تو ہم کہتے ہیں کہ ہم سرمایہ کار غیر ملکی لائیں گے۔ وہ 50 فیصد سرمایہ کاری کرے گا اور یہ دو سو ملین کا پروجیکٹ ہے۔ لیکن اس پر پابندی

لگ جاتی ہے، کارپوریٹ کے قوانین میں کُچھ ایسے حصّے ہیں جس میں پابندی ہے۔

نعیم طاہر: یعنی فرض کیجیے کہ سرمایہ کاری کا پچاس فیصد اگر غیر ملکی سرمایہ دار۔۔۔۔

ناصر علی شاہ بُخاری: نہیں نہیں۔ ایک کمپنی 30 فیصد سے زیادہ سرمایہ کاری نہیں کرسکتی۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: پاکستان میں سرمایہ کاری کی پالیسی ماحول کے مطابق بالکل ٹھیک ہے۔ کہ سب سے پہلے حصص یافتہ کو اس بات کی ضمانت دی جائے کہ کوئی کاروباری فرد اس کے سرمایہ کا ناجائز استعمال نہ کرے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: کیونکہ وہ اپنی سبسڈی (Subsidy)، پرائیوٹ لیمیٹڈ کمپنیوں کو قرض دے دیتے تھے، لیکن اس میں ہولڈنگ کمپنی کی اجازت ہو کیونکہ ہولڈنگ کمپنی ہی سبسڈی میں سرمایہ کاری کرسکتی ہے۔ اس طرح حصص یافتگان کی دلچسپی بھی برقرار رہے گی۔ جاپان، کوریا، ترکی، ہندوستان، سنگاپور اور ملائیشیا وغیرہ میں سوائے ہولڈنگ کمپنی کے اور کوئی دوسرا انظام ہے ہی نہیں۔ ہمارا انظام فرسُودہ ہو چکا ہے۔

نعیم طاہر: جی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: ہم نے پالیسیاں بنا دیں، اصول و قواعد تشکیل دے دیے لیکن اس جانب توجہ نہیں دے رہے Asian) (Developement Bank نے حال ہی میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ پاکستان کی کارکردگی کی گذشتہ کئی برسوں کے مقابلے میں بہت عمدہ ہے، ایسے لگتا ہے کہ خوشحالی کا دور آنے والا ہے۔ لیکن سرمایہ کاری نہیں ہو رہی۔ مزید بڑی بڑی کمپنیاں نہیں بن رہی ہیں۔ صرف حکومت کی سطح پر سرمایہ کاری ہو رہی ہے۔ نجی شعبے سامنے نہیں آ رہے۔ مجھے امید ہے کہ اگلے سال بجٹ میں اس معاملے پر توجہ دی جائے گی۔ پاکستان میں ہولڈنگ کمپنیوں کا اجراء وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مقامی سطح پر بھی بڑے پیانے پر سرمایہ کاری کی جائے۔ پاکستان میں ایک بڑی کمپنی اگر پبلک ہوتی ہے تو عالمی منڈی میں سے اُس کے لیے سرمایہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ Oil and Gas Developement Corporation اب پبلک ہو رہی ہے۔

نعیم طاہر: آپ کے خیال میں اگر ہولڈنگ کمپنیوں کو اجازت دی جائے تو ملک میں سرمایہ کاری بڑھ جائے

گی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: بے شمار بڑھ جائے گی۔

نعیم طاہر: غیر ملکی کمپنیاں بھی زیادہ حصّہ لیں گی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: آپ کے پاس اختیار ہوگا۔

نعیم طاہر: جی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اب آپ World Trade Organization کے حوالے سے دیکھیں۔ ہمارے پاس ملک کا سب سے بڑا شعبہ ٹیکسٹائل کا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی ٹیکسٹائل کمپنی نہیں ہے جو اپنی انفرادی حیثیت میں غیر ملکی سرمایہ داروں سے یہ کہہ سکے کہ مجھے دو سو یا پانچ سو ملین ڈالر سرمایہ کاری کے لیے درکار ہیں۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

ناصر علی شاہ بُخاری: ماشاءاللہ پاکستان میں ایسے گروپس ہیں جن کے ٹیکسٹائل کے شعبے میں دس دس کمپنیاں بنی ہوئی ہیں لیکن اگر آپ ان کو مشترک کر دیں اور ایک ہولڈنگ کمپنی بنا دیں تو ان کی سرمایہ کاری اکٹھے کرنے کی صلاحیت بڑھ جائے گی اور اپنے کاروبار کا جال بھی پھیلا دیں گے۔

نعیم طاہر: بالکل صحیح۔ عام سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اگر ان کا اختیار بڑھ جائے گا تو ان کی کارکردگی اور لوگوں کا ان پر اعتماد بھی زیادہ ہوگا۔ سرمایہ دار اپنی مرضی سے چھوٹی یا بڑی کمپنیوں میں سرمایہ داری کرسکتے ہیں۔

بخاری صاحب ابھی آپ نے World Trade Organization کا ذکر کیا۔ ان سے ہمارے تعلقات کافی زیر بحث رہے ہیں۔ کیا اس سے ہماری معیشت پر بھی اثر پڑتا ہے؟

ناصر علی شاہ بُخاری: پاکستان کا سب سے اہم شعبہ ٹیکسٹائل ہے اور گذشتہ پانچ برسوں سے ٹیکسٹائل کی مد میں سب سے زیادہ سرمایہ کاری ہو رہی ہے اور کافی ترقی بھی ہوئی ہے۔ پاکستان کے ٹیکسٹائل کے کچھ شعبے ایسے ہیں جن میں پاکستان کی برآمدات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اس ضمن میں چھوٹے چھوٹے پیانے پر کاروبار کرنے والے مشکلات کا سامنا کریں گے کیونکہ وہ WTO کی شرائط پوری نہیں کرسکتے کیونکہ اب WTO کی بے شمار شرائط آ گئی ہیں۔

Scanned with CamScanner

مثلاً ماحول کے متعلق، مزدور کی عمر کے حوالے سے وغیرہ تو اس میں کئی روایتی صنعتیں نقصان اٹھا سکتی ہیں۔

نعیم طاہر: آپ کا مطلب ہے کہ کپڑے کی صنعت کو بھی مشکلات پیش آسکتی ہیں؟

ناصر علی شاہ بُخاری: کپڑے کی صنعت کوٹہ کے حوالے سے تو اس وقت نقصان میں ہے، اگر ہم پر کوٹہ کی پابندیاں ختم ہو جائیں تو ہمیں موقع ملے گا کہ ہمارا کپڑا پوری دُنیا میں برآمد ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی صنعتیں ہیں۔ ہمیں انشورنس اور بینکنگ کے شعبے کھولنا ہوں گے۔

نعیم طاہر: ٹھیک۔

ناصر علی شاہ بُخاری: دُنیا کے بڑے بڑے بینکوں میں چھوٹے چھوٹے بینک ضم ہو رہے ہیں اور دُنیا بھر میں اپنا جال پھیلا رہے ہیں۔ سرمایہ کاری کے نئے قوانین آ رہے ہیں۔ ہمیں بھی اس کی اشد ضرورت ہے۔

نعیم طاہر: تیاری کرنی چاہیے۔

ناصر علی شاہ بُخاری: جی بالکل تیاری کرنی چاہیے۔

نعیم طاہر: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں حکومت کا اہم کردار ہے؟

ناصر علی شاہ بُخاری: حکومت کا سب سے اہم کردار یہ ہے کہ وہ WTO کے مطابق بنیادی ڈھانچہ یا سہولیات فراہم کرے۔ اس حوالے سے آپ دیکھیں کہ حکومت کی جانب سے گوادر کی بندرگاہ کا منصوبہ نہایت شاندار اور قابلِ تحسین اقدام ہے۔

صدر پاکستان نے حکومت چین کے سربراہان کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ پاکستان میں اس منصوبے پر سرمایہ کاری کریں۔ ایک نیا شہر آباد ہو جائے گا گوادر کے ساحل سے ہماری دوسرے ملکوں مثلاً ایران، افغانستان اور وسط ایشیا کے ساتھ درآمدات و برآمدات کی نئی راہیں کُھل جائیں گی۔

نعیم طاہر: اب کراچی بندرگاہ کے ساتھ ساتھ گوادر بندرگاہ سے بھی ملکی معیشت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ گوادر بندرگاہ کا سب سے بڑا فائدہ کیا اس کا جغرافیائی محل وقوع ہے؟

ناصر علی شاہ بُخاری: اس کی جغرافیائی محل وقوع بھی ہے اور اس کے ساتھ سب سے اہم سبب یہ ہے کہ سارا وسطی ایشیا دوسرے ملکوں سے گھرا ہوا ہے اور یہاں کوئی ساحل نہیں۔ یہ ان ملکوں کے لیے قریبی بندرگاہ

ہوگی۔

نعیم طاہر: اس طرح تجارت میں ایک سہولت پیدا ہوگی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: وہاں پر پٹرولیم یا قدرتی، معدنی گیس سے حاصل کردہ پیداوار کے منصوبے لگائے جاسکتے ہیں۔ یہ صنعتوں کا مرکز بن سکتا ہے۔ اسی طرح کراچی سے لے کر پورے پاکستان تک سڑکوں اور ریلوے لائنوں کا جال بچھایا جائے۔ بنیادی سہولیات میں بجلی فراہم کی جائے۔ پیغام رسانی کے لیے ٹیلی مواصلات کو فروغ دیا جائے۔ اگلے بجٹ میں اُمید ہے کہ ترقیاتی منصوبوں پر بڑا کام ہوگا۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اس سے ہماری پیداوار کی شرح میں بھی اضافہ ہوگا اور ساری دنیا میں پاکستان کی بڑھتی ہوئی معیشت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

نعیم طاہر: آپ نے ابھی ایک بات کہی کہ چھوٹے پیمانے پر کاروبار کرنے والے حضرات WTO کی شرائط کی زد میں آئیں گے جیسا کہ قالین اور چمڑا بنانے والی صنعتیں۔ ایسی صورتحال میں آپ ان کو کیا مشورہ دیں گے کہ ان کی معیشت بھی خراب نہ ہو اور خود کو صورت حال کے مطابق ڈھال لیں؟

ناصر علی شاہ بُخاری: وہ اپنی معیشت کے پیمانے کو بلند سطح پر لے کر جائیں۔ مثال کے طور پر اگر سارے چمڑا بنانے والے متحد ہو جائیں اور چمڑا تیار کرنے کے دوران جو فاضل پانی باہر نکلتا ہے اس کو عمل میں لائیں۔

نعیم طاہر: Water Treatment Plant

ناصر علی شاہ بُخاری: یہاں پر انہیں مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔

نعیم طاہر: اچھا بخاری صاحب، پاکستان میں ذخائر اور اثاثہ جات کافی زیادہ ہیں۔ شاید تاریخ میں اتنی تعداد میں نہیں رہے ہوں گے۔ کیا ان ذخائر اور اثاثہ جات کا اثر کاروبار یا تجارت پر بھی پڑتا ہے اور معیشت کی شرح میں بھی اضافہ ہے؟

ناصر علی شاہ بُخاری: آپ نے صحیح فرمایا کہ اس سے ہماری قدر میں اضافہ ہوگا۔ لیکن یہ ایک مسلسل جدوجہد ہے جو مزید دو تین برس جاری رہے گی۔ پھر اس ماحول کے نتائج سرمایہ کاری کی صورت میں نظر آئیں گے۔ لیکن ابھی تک پاکستان میں بچت کی شرح اتنی زیادہ نہیں ہے کہ جس سے سرمایہ کاری ہو سکتی

Scanned with CamScanner

ہو۔ ہماری بچت کی شرح بہت کم ہے۔ لیکن اس ماحول میں بڑھ سکتی ہے۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: بینکوں کی شرح سود بھی کم ہے۔ اب لوگ سرمایہ کاری کی طرف مائل ہو سکتے ہیں اور روزگار کے ذرائع بھی بڑھ جائیں گے۔

نعیم طاہر: بچت پر سُود کی شرح یا منافع بہت کم ہو گیا ہے، مثال کے طور پر میں ریٹائرڈ آدمی ہوں۔ میں دس لاکھ روپے میں قابلِ ذکر کاروبار نہیں کر سکتا۔ میں نے دس، پندرہ یا بیس لاکھ بینک میں رکھ دیا اب اس کے منافع سے میں اپنی ضروریات پوری کرتا تھا۔ میرے پاس اب کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جس دور میں ہم کاروبار کرتے تھے اس وقت شرح سود میں زیادتی کاروبار کو تباہ کر دیتی ہے۔ اب یہاں دو سوال ہیں۔ ایک طرف سود کی شرح میں کمی سے بینکوں پر کیا اثر پڑے گا اور دوسرا سوال یہ ہے کہ شرح سود میں کمی نے ریٹائرڈ حضرات اور گھریلو خواتین کی معاشی زندگی کو کتنا متاثر کیا ہے۔

ناصر علی شاہ بُخاری: ہمیں یہاں اپنی بچت کو صحیح استعمال میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ مشاورت ہونی چاہیے کہ کس طرح ہم اپنی بچت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اپنی بچت کو 2 یا 3 فیصد شرح سود پہ بینک میں جمع کروانے کی بجائے ان پیسوں سے سرمایہ کاری کی جائے۔
آج بھی بہت سی کمپنیاں ہیں جن کا منافع گیارہ فیصد آتا ہے۔ مثلاً (PTCL) پی ٹی سی ایل۔

نعیم طاہر: جی ہاں۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اگر آج PTCL کا حصص اس قیمت پر لیں تو بارہ فیصد منافع ملتا ہے۔ آپ HUBCO کا حصص لیں اس میں بھی منافع ملتا ہے۔ میں نے آپ کو High Yeild Dividend Companies کی چند مثالیں دی ہیں۔

نعیم طاہر: جی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: لیکن ایک بات یہاں نہیں بھولنی چاہیے اور پوری قوم مبارکباد کی مستحق ہے کہ یہ پاکستان کی تاریخ میں سب سے کم افراطِ زر کی شرح ہے۔

نعیم طاہر: آپ مستقبل میں کیا دیکھتے ہیں؟

ناصر علی شاہ بُخاری: میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس دور میں ہم پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہاں ہمیں مختلف چیلنجز کا سامنا ہے، پاکستان کی معیشت، غربت کیسے کم کریں، تعلیم کو کیسے بڑھائیں وغیرہ۔

ہمارے خاندان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تعلیم کی طرف توجہ مرکوز کریں۔

نعیم طاہر: اچھا۔

ناصر علی شاہ بُخاری: اس سلسلے میں میرے چھوٹے بھائی نے اس مقصد کی تکمیل کرتے ہوئے کراچی میں ایک بہت بڑی انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی یونیورسٹی بنا رہے ہیں۔

نعیم طاہر: کس نام سے۔

ناصر علی شاہ بُخاری: KASBIT

نعیم طاہر: آئی ٹی۔ اچھا۔۔۔

ناصر علی شاہ بُخاری: ایسا ادارہ قائم ہو رہا جس میں ہم دنیا بھر سے پروفیسرز کو لا رہے ہیں۔ اور Massachussetts Intitutes of Technology کے ساتھ انہوں نے اشتراک بھی کیا ہے۔

نعیم طاہر: بہت خوب، بہت اچھی بات ہے۔

ناصر علی شاہ بُخاری: لیکن مالیاتی شعبے میں ابھی بہت بہتری لانے کی ضرورت ہے، جیسا کہ میں عرض کر رہا تھا کہ اثاثہ جات کے انتظام، نجی بینکاری اور سرمایہ کاری کے لیے مزید بہتر اقدام کی ضرورت ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ آگے چلیں گی۔

نعیم طاہر: بخاری صاحب آپ؛ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہمارے لیے اتنا وقت نکالا اور ہمارے ناظرین سے بات کی۔

ناصر علی شاہ بُخاری: میں بھی آپ کا ممنون ہوں۔

Scanned with CamScanner

اختتامیہ:

میری خواہش ہے کہ میرے ناظرین میں بھی یہ جذبہ بیدار ہو کہ انسان اپنی قابلیت، صلاحیت، خود اعتمادی، ہمت اور ژرف نگاہی سے جب کسی کام کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔ خادم علی شاہ بخاری اس کی ایک زندہ مثال ہیں جو کہ اب ICON بن گیا ہے۔ اب اسی روایت کو اُن کے صاحبزادے ناصر علی شاہ بخاری آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہی عظیم شخصیات پاکستان کی تاریخ روایات کو شاندار بنا رہی ہیں تاکہ آنے والی نسلیں اپنے مستقبل کا بہترین لائحہ عمل تیار کر لیں۔ میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نعیم طاہر

☆☆☆

محمود علی

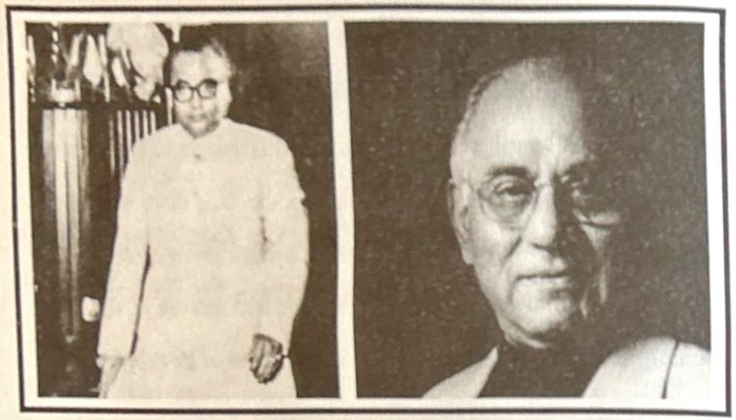

Assam under the then Chief Minister Sir Muhammed Saadulah until 1946, and later as a member of the East Bengal Legislative Assembly. Mahmud Ali's grandfather and head of the Ali family, Moulve Musharraf Ali, originally hailed from Shahbazpur in greater Comilla, where some of his ancestors had served as Mir al Bahr (Commander in Chief of the Imperial Navy in the Padma region of Bengal under the Emperor of Delhi.

Mahmud Ali matriculated from the Sunamganj Government Jubilee High School in 1937 and studied at the MC College, Sylhet. He continued his studies in St. Edmunds College and St. Anthony's College and graduated with honours in English in 1942. After graduation he studied law at Calcutta University but did not continue his studies due to his involvement in the Freedom Movement.

Freedom Movement

All India Muslim League

Mahmud Ali was elected as the first student President of the Assam Provincial Muslim Students Federation when Raja of Mahmudabad was President of the All India Muslim Students Federation. In 1946 he was appointed as a member of the Assam Muslim League Working Committee by the President of the Assam Provincial

Mahmud Ali

Mahmud Ali (1 September 1919 - 17 November 2006) was a progressive leftist Pakistani politician known for his agrarian politics. He was part of the Freedom Movement and played an important role during the Sylhet referendum which led to its merger with East Bengal. As member of Pakistan's Second Constituent Assembly he demanded the recognition of Bengali as one of the national languages of Pakistan and advocated the cause through his newspaper, the *Nao Belal*. He strongly opposed the 'One Unit' scheme and voted against the merger in 1956. After the dissolution of the assembly and abrogation of the 1956 Constitution he worked towards the restoration of provinces and a parliamentary form of government based on adult franchise.

Early Life and Family

Mahmud Ali was born into a Bengali Muslim family of lawyers, writers and politicians on September 1, 1919 in [illegible], Sunamganj, Sylhet District. His father, Moulvi Mujahid Ali was a writer, poet and law graduate from the Aligarh Muslim University. His uncle, Moulvi Munawwar Ali, served as a minister in the Government of

Muslim League, Moulana Abdul Hamid Khan Bhashani. He was later elected as the general secretary in 1946 at the age of 26.

The Line System and Civil Disobedience Movement

The Government of India Act, 1935 made provisions for a Legislative Assembly in each province in British India; and elections for the Assam Legislative Assembly were held in 1937. Sir Syed Muhammad Saadullah was elected to the assembly and in he same year joined the All India Muslim League on Jinnah's request. Saadullah led a coalition government three times between 1 April 1937 and 11 February 1946. He supported Assam's inclusio within the new state of Pakistan and opposed the Line System which restricted Muslim immigrants to certain areas of Assam. The System originated in the district of Nowgoing in 1920 and the lines were drawn with no fixed principles in determining them. Immigrant opposition grew and became a powerful force under Bhashani. On 15 September 1937, Mahmud Ali's uncle, Munawwar Ali moved a resolution in the Legislative Assembly calling for the abolition of the Line System. He argued that Bengali immigrants had brought "prosperity ... and wealth to the province of Assam". The motion was supported by Abdul Matin Choudhury.

Abdul Hamid Khan Bhashani adopted an uncompromising

attitude and the resolution of the Working Committee of the Assam Provincial Muslim League held on 15 December 1944, called upon the government to abolish "the illegand and pernicious Line System" and immediately provide land to landless Bengali immigrants. On 11 February 1946 a Congress Ministry was formed with Bardoloi as Premier. He proceeded to deal with the immigrants by eviction under the Resolution of 13 July 1945 which was passed under Saadullah's regime. Bhashani strongly opposed he eviction and advised the landless and evicted to 'spread out'. The Assam Provincial Muslim League also decided to challenge the legality of the Line System in Court.

As General Secretary of the Provincial League, Mahmud Ali stated, "The Muslim League is prepared for all eventualities and shall not retrace an inch from the chosen path. They are determined to disregard any laws which are not based on moral force". The Working Committee of the Provincial League met on 17 and 18 November 1946 and proposed to submit the issue to the arbitration of Liaquat and Nehru. The proposal was rejected by the Premier Bardoloi and eviction operations continued. Towards the end of December 1946, Bhashani, along with Mahmud Ali chalked out a programme of Civil Disobedience against he Assam Government's eviction policy and repression of Muslims. Ali sent a telegraphic message to the chairman, Committee of Action of the AIML

Scanned with CamScanner

constituent assembly, and in the 1956 Constitution.

Ganatantri Dal

Disillusioned with the Muslim League government Ali left the party in 1952, and on 19 January 1953 founded a secular political party, the Ganatantri Dal, with Haji Mohammad Danesh, a Kisan leader. The Ganatantri Dal was the first to open its doors to non-Muslims on an equal footing and demanded a secular constitution. The party manifesto included the demand for the abolition of feudalism without any compensation, the release of political prisoners, secession from the Commonwealth, nationalisation of jute trade, equal rights for women and minorities in social, political and economic spheres, and abolition of visa system between Pakistan and India.

Ali spoke out against the League's pro-west stance and called for an independent foreign policy. As president, Mahmud Ali opposed the US-Pakistan Military Aid Pact signed on 19 April 1954 and on his party's appeal almost all political parties observed "Anti US-Pakistan Military Pact Day".

Ali was elected the member of the National Assembly of Pakistan for constituency Sylhet-I in 1965 as a representative of the National Democratic Front. He lost the next election, in 1970, as a Pakistan

Democratic Party candidate for the assembly.

<u>PERSONAL DETAILS</u>

Born:

1 September 1919, Sunamganj (Sylhet), Assam British India (now in Bangladesh)

Died:

17 November 2006 (aged 87), Lahore, Pakistan

Nationality:

Pakistani

Political Party:

All India Muslim League, Ganatantri Dal, United Front,

National Awami Party,

National Democratic Front, Pakistan Democratic Movement

Spouse:

Begum Hajera Mahmud

Residence:

Islamabad, Pakistan

General Secretary of All India Muslim League (Assam) - In Office:

1946 - 14 August 1947

Scanned with CamScanner

Letter to M.D. PTV

Regd. A.D

To,
MD PTV, Headquarters, Islamabad.
Dated: September 13th, 2021
SUBJECT: <u>Recording of Mr. Mehmud Ali, State Minister 1970, East Pakistan.</u>

Dear Mr. Amir Manzoor,

I hope you are doing well. I am writing this letter to you for very particular reason. Earlier in 2000 I made a recording of some such personalities which had been witnesses to history making in Pakistan. It covered various fields. One field was covered by Mr. Mehmud Ali who was at that time the minister from East Pakistan and Bangladesh separated but Mehmud Ali refused to go back to Bangladesh and he preferred to stay in Pakistan. He was given the status of state minister. I interviewed him. I think that interview has a lot of significance as a witness to making of history and changes in history.

I made 10 recordings and Mr. Mehmud Ali was the last. I have a record of 9 recordings but this one, done in Islamabad, is missing and it is extremely important

I am writing to seek your help to provide me the copy of the recording of Mr. Mehmud Ali for my record. All details are as under:

TELEVISION CENTRE LAHORE
PROGRAM: IN CAMERA
COMPARE: NAEEM TAHIR
GUEST: MEHMUD ALI
PRODUCER: SOHAIL AHMED
PERIOD: Around 2002
RECORDED IN RAWALPINDI
I am an old employee of PTV as I was Principle CTI in early days!
I look forward to your cooperation and help in saving an important statement about historical events in Pakistan.
Thank You!
Yours Truly,

M. Naeem Tahir.
Ex. Chief Executive National Council of the Arts
Res: 122-B, Model Town Lahore
PH: 0333-4638010

Member of East Bengal Legislative Assembly - In office: 12 March 1954 - 27 May 1955

Member of Second Constituent Assembly - In office: 28 May 1955 - 22 March 1956

Member of National Assembly - In office: 23 March 1956 - 7 October 1958

Minister of State (Rank & Status) - In office: 29 December 1971 - 17 November 2006

☆☆☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر فرزانہ ریاض

ڈاکٹر فرزانہ ریاض معروف مترجم، محقق اور شاعرہ ہیں۔ وہ پاکستان کے قدیم تاریخی ادارے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ان کا دائرہ اختصاص بیسویں صدی کی جدید اردو غزل ہے۔ ان کے تحقیقی مضامین انگریزی اور اردو کے اہم ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے "بیسویں صدی کی اردو غزل (کلاسیکی رجحانات و میلانات کا احیا)" کے عنوان پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر جامعہ پنجاب سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اردو غزل کے جمالیاتی دبستان اور جدید غزل کے مابعد الطبیعاتی مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ حال ہی میں ان کی تین کتابیں ملک کے مؤقر اداروں سے شائع ہو رہی ہیں۔ جن کا تعلق روسی ادب، سوانح نگاری اور جدید اردو غزل کے موضوعات سے ہے۔

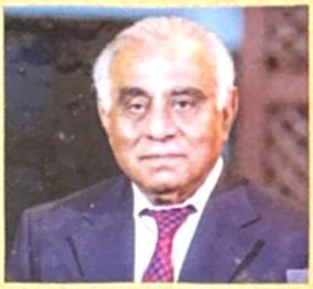

نعیم طاہر

محمد نعیم طاہر پاکستان کے نامور اداکار، مفکر، کالم نگار، فلم، تھیٹر اور ٹیلی ویژن کے لکھاری، دانش ور، اور محقق ہیں۔ وہ سابق، سیکرٹری جنرل، الحمرا، چیف ایگزیکٹو پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس، چیف آرگنائزر ہارس اینڈ کیٹل شو، ڈائریکٹر سیف گیمز اور پرنسپل سنٹرل ٹیلی ویژن انسٹیٹیوٹ رہ چکے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے لیے اِن کی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے "National Icon" ایوارڈ اور امریکہ کی طرف سے "kennedy" ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اِن کی نصف بہتر یاسمین طاہر، مشہور مصنف سید امتیاز علی تاج اور مصنفہ حجاب امتیاز علی کی صاحبزادی ہیں یاسمین طاہر وہ واحد شخصیت ہیں جن کو پاکستان کی طرف سے بطور براڈکاسٹر ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔

Rs. 2800.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-3520-0
ISBN-13: 978-969-35-3520-4

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Scanned with CamScanner